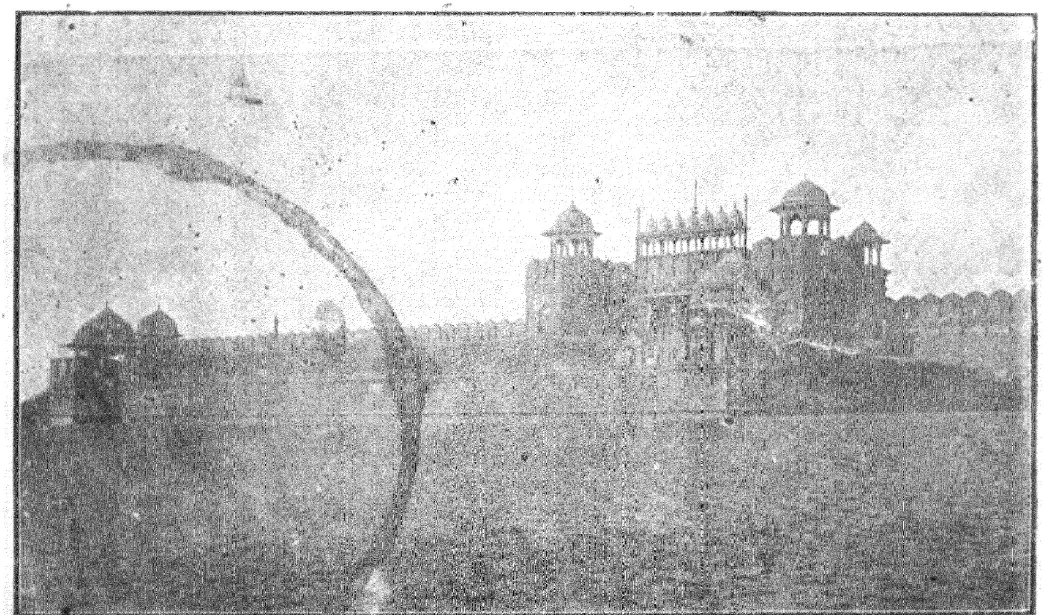
DAMAGE BOOK

جلد دوم | بابت جنوری سنہ ۱۹۲۲ء | حصۂ پنجم

اُردو



انجمن ترقی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ

جزوِ اوّل تاریخی

از

جناب مولوی سید غلام یزدانی صاحب ایم اے۔ ایم آر۔ اے ایس ناظم آثارِ قدیمہ حیدرآباد دکن

سلطان محمد قطب شاہ

بانیِ شہر حیدرآباد

نسب | تیرھویں صدی عیسوی میں جب ہلاکو کی ترک تازنے بغداد کی سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ تو تاتاری قبیلے ٹڈی دل کی طرح ایشیاء کوچک تک پھیل گئے۔ ان میں سے ایک قبیلے نے جلائر خاندان کی امداد سے آرمینیا اور آزر بائی جان میں خود مختار حکومت قایم کی۔ اور رفتہ رفتہ ایسا زور پکڑا کہ پندرھویں صدی کے آغاز میں بغداد پر تسلط حاصل کرلیا۔ یہ قبیلہ تاریخ میں آق قوینلو کے نام سے مشہور ہے۔ ترکی میں قوینلو مینڈھے کو کہتے ہیں۔ اور آق سیاہ رنگ کے واسطے استعمال ہوتا ہے چوں کہ اس خاندان کے فوجی جھنڈے پر سیاہ مینڈھے کی تصویر تھی اس لیئے یہ لقب مشہور ہوگیا۔ دکن کی قطب شاہی سلطنت کا بانی اسی خاندان سے تھا۔

---

[1] کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ پر جو اُردو کا نہایت قدیم مرتب کلام ہے میں تبصرہ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کلام پر تبصرہ لکھنے سے قبل یہ ضرور تھا شاعر اور اس کے زمانہ کے حالات سے ناظرین کو متعارف کیا جائے۔ میں اپنے مؤرخ دوست اور شفیق مولوی سید غلام یزدانی صاحب ایم اے ایم آر اے ایس ناظم سررشتہ آثارِ قدیمہ (ریاست حیدرآباد دکن) کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے یہ حصّہ لکھ کر مجھے بہت بڑی فکر و زحمت سے بچا دیا۔ سید صاحب موصوف کی نظر تاریخ میں بہت وسیع ہے اور خصوصاً خاندان قطب شاہیہ کے تو وہ جید مؤرخ ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اُن کی تحریر کو اپنے مضمون کا مقدمہ بنالوں

بانیِ خاندان کے دکن میں آنے کی وجوہ

آق قوینلو خاندان کا ستارہ کچھ زیادہ عرصہ عروج پر نہ رہا چنانچہ بغداد میں حکمرانی کرتے ابھی نصف صدی ہی گزرنے پائی تھی کہ تاتاری نسل کے ایک اور خاندان نے جن کے پرچم پر سفید مینڈھے کی تصویر تھی ' سیاہ مینڈھے' والوں کو سلطنت سے بے دخل کر دیا۔ اور ان کے رئیس کو ایسا تنگ کیا کہ اُس کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور بھاگ کر جابجا پناہ گزین ہونا پڑا۔

دکن میں اس وقت بہمنیہ سلاطین بادشاہی کر رہے تھے۔ ان کی داد و دہش، قدر دانی کمال اور دربار کی شان و شکوہ کا شہرہ بلادِ اسلامیہ میں پہنچ چکا تھا۔ علم و فضل کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ شعراء قصائد پڑھتے تھے۔ اور منہ مانگی مرادیں پاتے تھے۔ اگر فرشتہ کی روایت صحیح ہے' تو حافظ شیرازی کو بھی محمود شاہ بہمنی کی سخاوت اور علم دوستی نے دکن آنے پر مائل کر دیا تھا۔ اور وہ شیراز سے روانہ ہو کر لار کے راستہ ہرمز تک آئے۔ لیکن بادِ مخالف اور سمندر کے تلاطم نے شاعر کے دل کو ایسا دہلایا کہ جہاز سے اُتر کر وطن واپس چلے گئے اور یہ غزل میر فضل اللہ انجو کو جن کی معرفت دربار میں طلب کیے گئے تھے لکھ کر بھیجدی

غزل

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد	بمے بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد
بکوے می فروشانش بہ جامی بر نمی گیرند	زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد
رقیبم سرزنشہا کرد کزیں باب رُخ برتاب	چہ اُفتاد ایں سرِ ما را کہ خاکِ در نمی ارزد
بس آساں می نمود اوّل غمِ دریا بہ بوئے سود	غلط گفتم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد
شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جاں درو درج ست	کلاہِ دلکش ست اما بہ ترکِ سر نمی ارزد
بشو ایں نقشِ دلتنگی کہ در بازارِ یکرنگی	بہ نعمت ہائے گوناگوں مئے احمر نمی ارزد

چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دوں بگذر

کہ یک جو منتِ دوناں بصد من زر نمی ارزد

طوائف الملوکی کی کثرت کی وجہ سے اس زمانہ کے شاہی درباروں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر بادشاہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱) مگر انھوں نے کچھ ایسی خوبی سے لکھا ہے کہ وہ اصل مضمون پر چھا گیا ہے اور اصل مضمون اس کا طفیلی ہو گیا ہے۔ (اڈیٹر)

کی صحبت میں بگڑے ہوئے رؤسا اور نو عمر شاہزادوں کا مجمع رہتا تھا۔ سلاطین اعزاز خاندانی کے خیال سے ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور اپنے جلو میں رکھنا باعثِ تزک و شان سمجھتے تھے۔ ذاتی جوہر اور لیاقت کے موافق مناصب جلیلہ بھی عطا فرماتے تھے۔ سلطان قلی بانیِ خاندانِ قطب شاہیہ کے دکن آنے کے متعلق مورخین نے رنگا رنگ کی روایتیں لکھی ہیں۔ کہیں بزرگانِ دین کی پیشین گوئیاں نقل کی ہیں، کہیں خوابوں کی تعبیر بیان کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اول تو جان بچانے کا خیال درپیش تھا دوسرے سیاحوں سے دکن کے بادشاہوں کے جاہ و حشم اور وہاں کے اُمرا کی شان و شوکت کے قصے سُنے تھے۔ یہی بیم و اُمید کے اسباب تھے جو سلطان قلی کو اِس مُلک میں کھینچ لائے اور اوائل عمر ہی میں وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ محمود شاہ ثانی نے جو اس وقت تخت پر متمکن تھا، نووارد شہزادے کو ہونہار دیکھ کر اپنے خاص ملازمین کے زمرہ میں شامل کر لیا اور اولاد کی طرح شفقت کرنے لگا۔

بہمنی سلطنت کا زوال

محمود شاہ ایک حلیم الطبع لیکن کمزور اور عیش پسند بادشاہ تھا۔ اُمرا کی آپس کی چشمک اس کے باپ کے وقت سے چلی آتی تھی۔ چنانچہ اس عہد میں ایک دوسرے کے برخلاف دل کا غبار نکالنے کا خوب موقع ملا۔ محمود شاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی نظام الملک بحری امورِ سلطنت پر حاوی ہوگیا۔ اور یہ منصوبہ باندھا کہ یوسف عادل خاں کو زک دے کر ترکی امرا کا زور توڑ دے۔ چنانچہ سازشیں شروع ہوگئیں اور قصرِ شاہی میں کئی مرتبہ کشت و خون ہونے کے علاوہ ایک دفعہ بادشاہ کی جان بھی بال بال بچی۔ جب بدنظمی دن بدن بڑھتی گئی تو اطراف دارِ و ن نے علاقے دبا لیے۔ لیکن بادشاہ پر مطلق اثر نہ ہُوا اور وہ عیش کا متوالا دن رات رنگ رلیوں میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ تختِ فیروزہ کو جس کی مرصع کاری میں بہمنی بادشاہوں نے کئی پشت تک خزانے خالی کیے تھے توڑ کر جام و صراحی بنوا ڈالے۔ فرشتہ نے محمود شاہ کے دربار کی تصویر نہایت پر لطف کھینچی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ امورِ سلطنت سے بالکل غافل تھا اور حکومت کی باگ اُمرا کے ہاتھ میں تھی دربار میں دہلی اور لاہور کے گویئے اور کتھک اور ایران اور خراسان کے مطرب حاضر رہتے تھے۔ قصہ خواں اور داستان گو رنگین حکایات سے محفل کو گرم رکھتے تھے۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی رعایا نے بھی یہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ کہن سال شیوخ نے دخترِ رز کے عشق میں خرقے رہن کر دیئے۔ اور سفید ریش مکتب کے اُستاد لبطے کو بغل میں دبا کر شراب خانوں میں جا بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ سوائے تلنگانہ اور بیدر کی نواح کے کل ملک بادشاہ کے قبضے سے نکل گیا۔ اور آخر

وقت میں تو قاسم برید نے وکیل السلطنت کی حیثیت سے ایسا تنگ کیا کہ حکمرانی تو درکنار بادشاہ بغیر اس کی اجازت کے پانی بھی نہیں پی سکتا تھا۔ قاسم برید کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے امیر برید نے بادشاہ کے اوپر اپنے اثر کو گھٹنے نہ دیا۔ اور کٹ پتلی کی طرح اپنے اشارہ پر چلایا۔

قطب شاہی حکومت کی ابتداء

سلطان قلی کی رگوں میں ابھی تاتاری خون تازہ تھا۔ علاوہ ازیں آبا و اجداد کی چھ پشت کی بادشاہی نے شاہانہ خصائل میراث میں دی تھیں۔ چنانچہ شجاعت اور اولوالعزمی، دیانت اور آقا پرستی کے ایسے جوہر دکھائے کہ ابتداء عمر ہی میں قطب الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا اور تلنگانہ کا وسیع علاقہ صوبہ داری کے لیئے ملا۔ سلطان قلی نے اپنے آقا کے نمک کا ہمیشہ پاس کیا اور گو "بریدیوں" کے بادشاہ پر حاوی ہونے کی وجہ سے اسمٰعیل عادل خاں، ملک احمد نظام الملک اور علاء الدین عماد الملک نے محمود شاہ کی زندگی ہی میں خود مختاری کا اعلان کر کے سکہ اور خطبہ اپنے نام سے جاری کر دیا تھا لیکن سلطان قلی کی حمیت نے یہ دیدہ دلیری گوارا نہ کی اور جب تک محمود شاہ زندہ رہا خطبہ میں اسی کا نام برقرار رکھا۔ گول کنڈہ کی جامع مسجد کے کتبہ میں جو ۹۲۴؁ھ ہجری کا کندہ ہے محمود شاہ کا نام بادشاہ وقت کی حیثیت سے نہایت احترام سے درج ہے۔ اور سلطان قلی کا نام بطور بانیٔ عمارت کے لکھا ہوا ہے۔

۹۲۴؁ھ ہجری کے اواخر میں محمود شاہ کی وفات کے بعد سلطان قلی نے قطب شاہ کا لقب اختیار کیا اور گول کنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنا کر چھتیس برس تک بڑے کرّ و فر سے بادشاہی کی۔ اس عرصہ میں اس نے ساٹھ سے زیادہ قلعے اپنی بہادری اور قوتِ بازو سے فتح کیئے اور نل گنڈہ، کھامیٹ اور قرب وجوار کے راجاؤں اور زمینداروں کو جو بہمنی بادشاہوں کے ضعف کی وجہ سے شوخ چشم اور قریب قریب خود مختار ہو گئے تھے اپنا مطیع اور باج گزار بنا لیا۔ سلطان قلی ایک من چلا اور سورما سپاہی ہونے کے علاوہ نہایت ذی تدبیر سپہ سالار تھا۔ اور فن حرب سے خوب واقف تھا۔ جنگ کے موقع پر ایک تازہ دم دستہ ہمیشہ تیار رکھتا تھا۔ اور گھمسان کے وقت اِن سپاہیوں کو ساتھ لے کر غنیم پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ چنانچہ کئی لڑائیاں اس نے اسی طرح جیتیں۔ ایک اور چال جو وہ اکثر چلتا تھا یہ تھی کہ تھوڑی سی سپاہ کو کمین میں تیار رکھتا تھا۔ اور خود غنیم سے مقابل ہو کر پسپا ہو جاتا تھا جس وقت دشمن تعاقب کرتا تھا کمین کا دستہ چکر کاٹ کر پشت پر جم جاتا تھا۔ ادھر وہ فوج جو پسپا ہوتی تھی پلٹ کر سامنے

مقابل ہوتی تھی۔ اور دشمن چاروں طرف سے خطرنے میں پھنس جاتا تھا۔ تلنگانہ کے زمینداروں کے علاوہ، سلطان قلی کو اپنی قلمرو کی حدود کی حفاظت کے لیئے بیجاپور، احمدنگر اور بیدر کے نئے سلاطین سے بھی لڑنا پڑا اور بیجانگر کے راجہ کشن رائے سے بھی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ الغرض نوے برس کی عمر تک یہ بڈھا ترک ملک گیری میں مصروف رہا۔ اور ایک ایسی سلطنت کی نیو ڈال گیا جس کے استحکام نے ڈیڑھ صدی کے تزلزل کے بعد بھی اورنگ زیب جیسے رفیع القدر، اور مستقل مزاج بادشاہ کے دانت کھٹے کر دیئے[۱]۔

سلطان قلی کے عہد کے دو واقعات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک جنگ میں توپوں کا استعمال جو شمالی ہندوستان میں بھی تقریباً اسی زمانہ میں بابر کی پانی پت کی لڑائی سے شروع ہوا۔ دوسرا شیعہ مذہب کی ترویج جس کو سلطان قلی کی اولاد نے بھی نہایت جوش و خروش سے جاری رکھا۔ اور آج تک حیدرآباد میں بیسیوں عاشور خانے آبدار خانے قطب شاہی خاندان کے مذہبی اعتقادات کی زندہ یادگار موجود ہیں۔

سلطان قلی کے جانشین

سلطان قلی کے بعد اس کے تین بیٹوں نے یکے بعد دیگرے تریسٹھ برس سلطنت کی۔ ان میں سے آخری بادشاہ یعنی ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں مملکت کو بہت وسعت ہوئی۔ اور تلی کوٹ کی فتح کے بعد بیجانگر کے راجاؤں کا زور بہت گھٹ گیا جس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جنوبی علاقہ کے زمیندار جو بیجانگر کے حکام کی شہ سے روزمرہ بغاوت کرتے رہتے تھے۔ اب درست ہو گئے۔ علاوہ ازیں ملک میں فوج کا بیشتر حصہ ناگواری سپاہیوں کا ہونے کی وجہ سے جو بدامنی کا اندیشہ رہتا تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔

سلطان محمد قلی کی تخت نشینی

محمد قلی قطب شاہ سلطان ابراہیم قلی کا بیٹا تھا۔ اور باپ کی وفات کے بعد ۹۸۸ھ ہجری (مطابق ۱۵۸۰ء) میں تخت نشیں ہوا۔ ہندوستان میں اس وقت اکبری "شہنشاہی" کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اُدھر ایران میں شاہ عباس صفوی مسند حکومت پر بیٹھنے کو تھا۔ سلیمان اعظم کو بھی بساط دنیا سے رخصت ہوئے ابھی عرصہ نہ گزرا

---

[۱] سلطان قلی کی عملداری میں یہ علاقے شامل تھے۔ شرق مچھلی پٹن راجمندری اور اڑیسہ کی حد تک تمام ملک، شمال ملنگور اور یلگندل۔ غرب کوہیر تک تمام علاقہ، جنوب کوئل کنڈہ اور دریائے کرشنا تک تمام قلعے اور محالات۔ مروجہ جغرافیہ کے موافق اس سلطنت میں یہ اضلاع شامل خیال کیئے جا سکتے ہیں۔ ورنگل، نلگنڈہ، محبوب نگر، میدک، کریم نگر (بعض تعلقات)۔ علاوہ ازیں مدراس پریسیڈنسی کے گوداوری اور کرشنا کے اضلاع۔

تھا۔ اور یورپ میں اس کی فتوحات کی یاد تازہ تھی۔[1] اسلام کی تاریخ میں یہ زریں زمانہ علم سیاسیات کی اصطلاح "شہنشاہیت" کے لحاظ سے بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔

بیجاپور سے مصالحت

دکن کی اسلامی حکومتوں کے درمیان آپس میں ہمیشہ نزاع رہتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ابراہیم عادل شاہ والیِ بیجاپور سے اپنی بہن ملکۂ زماں کی شادی کردی۔ جس سے آیندہ کے لیئے ان دونو خاندانوں کے درمیان مصالحت ہوگئی۔ بادشاہ کو ملک میں امن ہونے کی وجہ سے رفاہِ عام کے کام کرنے کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ قانون میں بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ اور مال گزاری میں معقول رعایت کی گئی۔ تاریخ قطب شاہی کا مصنف لکھتا ہے کہ تقریباً دولاکھ ہون (چودہ لاکھ روپیہ) جو گزشتہ سلاطین کے وقت میں "محصول اجناس" کے عنوان سے جمع ہوتے تھے اس عہد میں بالکل معاف کردیئے گئے۔[2] قلمرو کے مختلف حصص میں مساجد مدرسے، محتاج خانے اور شفاخانے قائم کیئے گئے۔ اور مسافروں اور راہ گیروں کے آرام کے لیئے سرائے اور باولیاں بنائی گئیں اور لنگر خانے جاری کیئے گئے۔ بادشاہ کے خاص خزانچی میر ابو طالب کا بیان ہے کہ خیرات کی مد میں سالانہ ساٹھ ہزار ہون (چار لاکھ روپیہ) کا خرچ تھا۔ جس میں سے بارہ ہزار ہون (چوراسی ہزار روپیہ) ماہِ محرم ہی میں غربا کی امداد میں صرف ہوجاتے تھے۔

حیدرآباد کی بنا

محمد قلی کے عہد کا سب میں بڑا کارنامہ شہر حیدرآباد کی بنا رہے۔ چونکہ فرشتہ اس وقت زندہ تھا اس لیئے شہر کی ابتدائی حالت کے متعلق اس کی رائے قابل اعتماد ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "گولکنڈہ کی آب و ہوا متعفن اور خراب ہوگئی تھی۔ اس لیئے بادشاہ نے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک نہایت شاندار شہر بسایا جس کا نام ابتدا میں ایک محبوبہ کے نام پر بھاگ نگر رکھا گیا۔ مگر آخر میں وہ حیدرآباد کے نام سے مشہور ہوا۔ شہر کا دور دس میل کے قریب

---

[1] سلیمان اعظم نے ۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء تک سلطنت کی۔ اور اپنی مملکت کی حدود کو بوداپسٹ (کنار دریائے ڈینوب) سے لے کر اسوان (کنار دریائے نیل) تک اور دریائے فرات سے لے کر جبل الطارق تک پھیلا دیا۔

[2] ملک عنبر نے اسی زمانہ میں دکن کے اُس علاقہ میں جو مرہٹواڑی (مہاراشٹرا) کے نام سے مشہور ہے قوانین مال گزاری میں بہت تغیر و تبدل کیا۔ تعجب نہیں کہ محصول اجناس کی تخفیف بھی ملک عنبر کے نئے قوانین کا نتیجہ ہو۔ کیوں کہ اس کے قائم کیئے ہوئے ضوابط کا عمل بہت جلد تمام دکن میں ہونے لگا۔

اور بازار اور راستے ہندوستان کے اور شہروں کے برخلاف کشادہ اور صاف ہیں۔ آب و ہوا لطیف اور پاک ہے اور بہتی ہوئی ندیاں بعض بڑے بڑے بازاروں کے پاس سے گزرتی ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب سایہ دار درخت ہیں جو نظر کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ دکانیں پختہ ہیں، بادشاہی محلات ہندوستان کے اور شاہی محلوں سے بہت زیادہ شان دار اور خوشنما بیان کیئے جاتے ہیں۔"

فرشتہ آگرہ اور فتح پور سیکری کی رونق کو دیکھ چکا تھا۔ علاوہ ازیں بیجاپور کی شان و عظمت بھی اس کے پیشِ نظر تھی۔ اِس لیئے حیدرآباد کی نسبت اس کی تعریف و توصیف قطب شاہی بادشاہ کے نفیس مذاق اور عمدہ تعمیر کی اچھی دلیل ہے۔ تاریخ قطب شاہی کے مصنف نے محلات اور باغات کی جو بادشاہ نے نئے شہر میں بنائے تھے ایک طویل فہرست لکھی ہے۔ آب و ہوا کی لطافت اور منظر کی خوش نمائی کے خیال سے یہ عمارات زیادہ تر رود موسی کے کنارے تعمیر کی گئی تھیں جس کی متواتر طغیانیوں نے اُن کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ اور اب سوائے ان بیانات کے جو کتبِ تاریخ اور سیاحوں کے سفرناموں میں قلم بند ہیں کوئی دوسرا ذریعہ ان کی کیفیت معلوم کرنے کا باقی نہیں۔ تاریخ قطب شاہی میں سے یہاں دو محلوں کی کیفیت نقل کی جاتی ہے۔

خدا داد محل یہ سر بہ فلک قصر موسی ندی کے کنارے داد محل[1] کے قریب تعمیر ہُوا تھا۔ آسمان کے سات طبقوں کی طرح رفعت کے لحاظ سے اس کے بھی سات درجے رکھے گئے تھے۔ سب میں بلند درجے کا نام الٰہی محل تھا اس سے اُتر کر محمدی محل تھا۔ محمدی محل کے نیچے حیدری محل تھا۔ جس کی دیواریں تمام زرنگار تھیں اور رنگ برنگ کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ حیدری محل کے زیریں حصے میں درجہ بدرجہ حسنی حسینی اور جعفری محل تھے۔ قصر کے تیار ہونے کے بعد بادشاہ نے بڑی دھوم سے جشن کیا۔ اعیانِ سلطنت اور فضلاء و شعراء کو انعام د

---

[1] نوشیرواں عادل کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے مظلومین کی دادرسی کے لیئے ایک زنجیر بارگاہِ خسروی میں لٹکا دی تھی جس کا ایک سرا بارگاہ سے باہر آویزاں رہتا تھا اور دوسرا سرا بادشاہ کے تخت سے بندھا ہُوا تھا۔ جب کوئی فریادی دادرسی کے لیئے زنجیر ہلاتا تھا بادشاہ کو خبر ہو جاتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے بھی جس کو بے کسوں کی امداد کا بڑا خیال تھا ایک عالی شان محل تیار کرایا تھا اُس کے دروازے بازار کے رُخ رکھے تھے۔ حکم تھا کہ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو۔ بغیر دربانوں اور چوبداروں کی مزاحمت کے خود بادشاہ کی خدمت میں عرض کرے۔ اس قصر کا نام داد محل رکھا گیا تھا۔

واکرام سے سرفراز فرمایا۔ میرک معین سبزواری نے جو تاریخ گوئی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ عمارت کی تعریف میں ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ جس کے آخری شعر سے تاریخ نکلتی ہے۔ **شعر**

تاریخ مرتب شد نقش کلکِ قضا

بر لوحِ بقا بنا، جاں بخش نوشت

فرانسیسی سیاح ٹیورنیر نے اس قصر کو دیکھا تھا اور اُسے بڑا تعجب ہُوا تھا کہ چھتیں باغوں کے بڑے بڑے تناور درختوں کا بوجھ جو مختلف طبقوں میں لگائے گئے تھے کیوں کر سہارے ہوئے تھیں۔

بارگاہِ خسروی بارگاہِ شاہی کا طول ہزار گز کے قریب تھا۔ چاروں طرف عالی شان ایوان اور محرابیں تعمیر کی گئی تھیں۔ دولت خانہ خاص کا دروازہ شرقی جانب تھا اور ہند وضع کا بنا ہُوا تھا۔ دو رفیع الشان ستونوں پر جن کی بلندی بیس بیس گز تھی بارہ گز لمبی پتھر کی کڑی ڈال کر چوکھٹ قائم کی گئی تھی اور دروازہ کے بالائی حصہ میں نہایت بلند عمارت بنائی گئی تھی۔ دولت خانہ کے دروازہ کے سامنے نقارخانہ تھا۔ حکم تھا ہر روز اُمراء اور عمائد فوج اپنے جلو کے ہاتھیوں اور سپاہ کے ہمراہ مجرے کی غرض سے بارگاہ میں حاضر ہوں۔ اور خدم وحشم کو مناسب مقام پر چھوڑ کر تنہا آداب بجا لائیں۔ بادشاہی شکوہ و وقار کے خیال سے فیل خانۂ خاص کے بہت سے ہاتھی اور شاہی فوج کے ایک ہزار پیادے دو رویہ صفیں باندھے بارگاہ کے صحن میں حاضر رہتے تھے۔ ان کے علاوہ دو دو حبشی سرداروں کی ماتحتی میں کئی سو مسلّح جوان پہرہ داروں کی حیثیت سے موجود رہتے تھے۔

بارگاہ کے صحن کے جنوبی جانب شاہی دفترخانہ تھا۔ غرب میں جام دارخانہ اور شاہی کارخانوں کی عمارات تھیں شمالی جانب دولت سرا کا دوسرا دروازہ تھا۔ جس کے صحن میں عہدہ داران فوج و فیل خانہ اور اہلِ قلم کے لیئے علیحدہ علیحدہ ایوان بنے ہوئے تھے۔ دولت سرا کے اندرونی حصہ میں کئی محل تھے۔ ان میں سے لعل محل، چندن محل، اور گگن محل ترک عرب اور دکنی سلح داروں کے لیئے مخصوص تھے۔ ایک اور بلند ایوان تھا جس میں پرانے معتبر ملازم اور مقرب سلح دار حاضر رہتے تھے۔ اعیانِ سلطنت اور فضلاء کا مجمع سخن محل میں رہتا تھا۔ اس محل کے شرقی جانب ایک نہایت وسیع ایوان تھا جس کا طول سو گز سے کم نہ ہوگا۔ یہ نعمت خانہ کے نام سے موسوم تھا۔ ہر روز صبح و شام اہلِ مجلس میں سے دس ہزار آدمی بادشاہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

افسوس ہے کہ دست بردِ زمانہ نے ان محلات کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ لیکن محمد قلی کی بنائی ہوئی عمارات کی شان و شوکت، مضبوطی و استحکام اور موزونی و تناسب کا اندازہ کرنے کے لئے چار مینار اور چار کمان حیدرآباد میں اب تک موجود ہیں۔ یہ دونوں اپنی وضع کی عمارات میں نظیر نہیں رکھتیں۔ محمد قلی کا مقبرہ بھی جو گولکنڈہ میں واقع ہے نہایت خوشنما عمارت ہے۔ (ملاحظہ ہو تصویر نمبر (۱))۔ اِس کے طرزِ تعمیر میں ہندو صنعت کا اثر نمایاں ہے۔

فنونِ لطیفہ کی سرپرستی

محمد قلی کو تعمیر کے شوق کے علاوہ دوسرے فنون کی بھی ترقی کا بہت خیال تھا۔ شعر و سخن کی طرف اِس کی طبیعت خاص طور سے مائل تھی۔ چنانچہ خود بھی شعر کہتا تھا۔ ایک مبسوط دیوان جس میں اس کا اُردو اور فارسی کلام درج ہے اب تک موجود ہے۔ میرے کرم دوست مولوی عبد الحق صاحب نے اِسی مضمون میں علیحدہ محمد قلی کے کلام پر بحث کی ہے۔ شاعری کے علاوہ خوش نویسی کا بھی اس بادشاہ کو بڑا شوق تھا۔ نستعلیق اور نسخ کے اُستاد ایران اور عراق سے آکر جمع ہو گئے تھے۔ ان کے خطوط کے اصلی نمونے حیدرآباد کی عمارات کے کتبوں میں اب تک موجود ہیں۔ چنانچہ جامع مسجد کے بیرونی دروازہ کا کتبہ خطِ نستعلیق میں بے مثل ہے اور اسی مسجد کی محراب کا کتبہ خطِ نسخ کا عمدہ نمونہ ہے۔ خوش نویسی کی تاریخ میں یہ میر عماد قزدینی کا زمانہ تھا۔ نستعلیق خط اوجِ کمال پر تھا۔ حروف کی نشست قلم کا زور اور ہاتھ کی صفائی دیکھنے کے قابل ہے۔[۱]

علم و فضل اور مذہبی تحریکات

علم و فضل اور مذہبی تحریکات کے لحاظ سے بھی یہ زمانہ بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔ اکبر کے عہد کے علماء کا حال اور خلوت خانہ کے مذہبی مناظروں کے قصے خلائق میں مشہور ہیں۔ ایران میں شاہ عباس کو مذہبِ اثنا عشری کا بڑا پاس تھا۔ دربار میں میر باقر داماد، شیخ علی نقی کمرہ، بہاء الدین عاملی، ابن حید رخوانساری، میرزا جلال اسیر، کوثری مولانا شانی کی صحبت رہتی تھی۔ شیعی شریعت کی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ایک مرتبہ مولانا شانی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں قصیدہ پڑھا۔ بادشاہ اس قدر محظوظ ہوا کہ مولانا کو سونے میں تلوا کر وہ رقم ان کو انعام میں دے دی۔ دکن کے سلاطین ابتدا سے جعفری مذہب کے حامی رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایران سے علماء کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ چنانچہ محمد قلی کے عہد میں شیعہ عقائد کو خوب رواج ہوا۔ حیدرآباد کی اس

---

[۱] جامع مسجد حیدرآباد کے کتبے رسالہ ایپی گریفیا انڈیکا بابت ۱۵-۱۹۱۴ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ قدیم خطاطی کے دلدادہ اُن کو دیکھ کر ضرور محظوظ ہوں گے۔

زمانہ کے علما میں میر محمد مومن استرآبادی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ میر صاحب صفوی دربار میں کئی برس تک شاہزادہ حیدر میرزا کے اتالیق رہ چکے تھے۔ علم و فضل کے علاوہ، بڑے زاہد اور متقی تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور وکیل السلطنت کے جلیل القدر عہدہ پر مقرر کیا۔

لباس اور حلیہ

متحف برطانیہ (برٹش میوزیم) میں سلطان محمد قلی کی ایک قلمی تصویر موجود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بادشاہ کے لباس اور خد و خال کے متعلق رائے پیش کرنے کی گنجائش ہے (تصویر نمبر ۲)۔ چار پشت کی دکن کی بود و باش اور موسم کے اختلاف نے تاتاری لباس کو بالکل اُتروا دیا ہے۔ سر پر سمور کی کلاہ کی بجائے دکھنی وضع کی پیچ دار پگڑی ہے۔ بَرے کی پوستین اور باناتی قبا کے عوض ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ زیب بدن ہے۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ہیں۔ داڑھی صاف ہے۔ اور چہرے مہرے سے تعیّش کے آثار نمایاں ہیں۔

اعیان سلطنت میر جملہ

شخصی حکومت میں بھی کامیابی کا انحصار بہت کچھ اعیانِ سلطنت کی قابلیت پر ہے۔ لیکن ایشیائی ممالک میں جہاں دربار میں خوشامدیوں کا مجمع رہتا تھا اور روزمرہ سازشیں ہوتی رہتی تھیں لائق وزرا، اور جاں نثار عمائد کا انتخاب سہل کام نہ تھا۔ اکبر کے بعض مورخ اس کے نورتن کی تعریف میں جادۂ اعتدال سے گزر گئے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل بھول گئے کہ بغیر اکبر کی دانشمندی اور ملکۂ مردم شناسی کے نورتن جمع نہ ہوتے اور جو نمایاں کام اُنھوں نے کیے وہ ایک بھی بن نہ پڑتا۔ سلطان محمد قلی بھی بڑا مردم شناس بادشاہ تھا۔ اِس کے عہد کے ایک وزیر میر محمد مومن استرآبادی کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ ایک اور رکن سلطنت جس کا حال بیان کرنے کے قابل ہے۔ میرزا محمد امین جو تاریخ میں میر جملہ[۵۱] کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کاردان وزیر نے اول مالیات کے ضوابط کو جو دکنی پنڈتوں کے داؤ گھات کی وجہ سے دامِ عنکبوت سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے صاف کیا اور گو سوریا راؤ[۵۲] معتمد مالیہ نے بہت سی گلچھٹیاں ڈالیں لیکن میر جملہ کے مقابل میں اس کی کوئی ترکیب پیش نہ گئی۔ سلطنت کے اندرونی معاملات کی اصلاح کے بعد میر جملہ نے سرحد کے علاقے کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی۔ اور کئی مہموں میں سپہ سالار کی حیثیت سے خود بھی شریک ہُوا۔ قلمرو کے

---

۵۱ میر جملہ یا امیر جملگی وکیل السلطنت کی مثل وزارت کا خطاب تھا۔

۵۲ سوریا راؤ غیر معمولی طور سے ذہین تھا اور علم سیاق میں ماہر ہونے کے علاوہ بے بدل منشی تھا۔

جنوبی حصّہ میں کڑپہ اور کرنول تک جو ملک فتح ہوگیا تھا۔ وہ میر جملہ کے حسنِ انتظام سے مستقل طور سے قبضہ میں آگیا۔
سلطان محمد قلی کے عہد کے آخر میں میر جملہ نے بستر کے راجہ کی سرزنش کے لیئے لشکر کشی کی اور ملنگور اور مندلیر میں مستحکم قلعے بنانے کے بعد مہینہ بھر تک راجہ کے ملک کو پامال کرتا ہُوا آخر دار الخلافہ میں پہنچ گیا۔ اس مہم میں گو قطب شاہی فوجوں کو آخر میں پس پا ہونا پڑا۔ اور راستہ میں بڑے بڑے دریا عبور کرنے پڑے۔ لیکن میر جملہ کے استقلال اور تدابیر کی بدولت لشکر کو زیادہ گزند نہ پہنچا۔

بیرونی تعلقات

شاہان سلسلۂ صفویہ کو اوّل تو آل عبا ہونے کا فخر حاصل تھا۔ دوسرے ان کے اسلاف میں کئی پشت تک بڑے بڑے پایہ کے بزرگ گزرے تھے۔ چنانچہ ان میں شیخ صفی الدین اردبیلی کا نام خاص طور سے مشہور رہے۔ قطب شاہی خاندان کے بادشاہ سلاطین صفویہ کا ہم عصر فرماں رواؤں کی حیثیت سے احترام کرنے کے علاوہ مذہبی نقطہ نظر سے بھی بڑا ادب کرتے تھے۔ سلطان قلی بانیِ خاندان قطب شاہیہ نے خطبہ میں شاہ اسمٰعیل صفوی کا نام اپنے نام سے قبل ارادت مندی کے اظہار کے لیئے داخل کردیا تھا۔ اس عقیدت کی وجہ سے رسل و رسائل کا سلسلہ دونوں خاندانوں میں ابتدا سے جاری تھا۔ سلطان محمد قلی کے عہد میں شاہ عباس صفوی نے اپنے خاندان کے ایک معزز شاہزادے اغزلو سلطان کو ایلچی کی حیثیت سے قطب شاہی دربار میں بھیجا۔ مؤرخین نے ان تحائف کی جو ایلچی اپنے ساتھ لایا تھا مفصل کیفیت بیان کی ہے۔ بیش قیمت اشیا میں موتیوں کا ایک نہایت خوب صورت تاج تھا۔ جس کی چمک دمک کے سامنے آنکھ نہ ٹھیرتی تھی۔ ایک مرصع خنجر تھا جس کا دستہ اور نیام قیمتی جواہرات سے مزیّن تھا۔ چالیس عربی نژاد گھوڑے تھے جن پر زربفتی زین پوش پڑے ہوئے تھے اور زین اور لگامیں تمام زریں تھیں۔ سلطان محمد قلی نے بھی ایلچی اور اُس کے رفقا کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ سب کو خلعتِ فاخرہ عنایت کیئے اور طرح طرح کے انعام و اکرام سے مہمانوں کے دل کو موہ لیا۔ کہتے ہیں کہ شاہ عباس نے ایلچی کی زبانی محمد قلی کی بیٹی کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ صفوی خاندان کے کسی شہزادے کے ساتھ اس لڑکی کا عقد ہو کر دونوں سلطنتوں میں دوستی اور یگانگت زیادہ استوار ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت محمد قلی کو شاہ عباس کی تائید کا ضرور خیال تھا۔ اکبر کے جد اعلیٰ تیمور کی یورشوں سے قطب شاہیوں کے اسلاف آذر بائیجان میں کئی مرتبہ جلا وطنی کی تکالیف بھگت چکے تھے اِس زمانہ میں بھی مغلیہ سلطنت کا دکن کے الحاق کا

منصوبہ محمد قلی کے لیئے دل خوش کن نہ تھا۔ برار اور احمد نگر فتح ہو چکے تھے۔ اور ست پوڑہ کی چوٹیوں پر شاہی فوجیں منڈلا رہی تھیں جن کی عقاب آسا نگاہیں اس تاک میں تھیں کہ شکار کو غافل پائیں تو گنڈے جوڑ کر ٹوٹ پڑیں۔

شاہ عباس کے ایک خط سے جو سلطان محمد قلی کے بھتیجے محمد قطب شاہ کے نام ہے' یہ بات صاف مترشح ہے۔ کہ محمد قلی اپنی سیاسی مشکلات کی اطلاع صفوی بادشاہ کو دیتا رہتا تھا۔ چنانچہ خط میں لکھا ہے کہ :-

"سلطان محمد قلی نے جو واقعات محمد قنبر علی کی زبانی کہلا کر بھیجے تھے ہم کو معلوم ہوئے۔ کمران اور پچ (کچھ) کا علاقہ فتح ہو گیا ہے۔ اب خشکی کے راستے سے آمد و رفت میں سہولت رہیگی اور رسل اور رسائل کے پہنچنے میں زیادہ تاخیر نہ ہو گی"

وفات | اکتیس برس تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد سلطان محمد قلی نے ۱۰۲۰ھ ہجری (مطابق ۱۶۱۱ء) میں وفات پائی اور اپنے واقعاتِ زندگی سے متقدمین کے لیئے زندہ دلی اور فیاضی انصاف اور رعایا پروری[1]، علم دوستی اور مردم شناسی کی عمدہ مثال چھوڑ گیا۔

حیدر آباد
۱۰، ستمبر ۱۹۲۱ء

غلام یزدانی

---

[1] مورخین کا بیان ہے۔ اس بادشاہ نے خود کبھی قتل کا حکم نہ دیا۔ ایسے مقدمات ہمیشہ دار القضاء کے سپرد کر دیتا تھا۔ صلۂ رحمی کا بھی اسے بہت خیال رہا۔ چنانچہ اپنے بھائیوں پر کسی قسم کا ظلم تشدد روا نہ رکھا۔ اور مناصب جلیلہ عطا کیئے۔ ہندو عہدہ داروں پر اعتبار کرتا تھا۔ چنانچہ بہت سی سرحدی مہمات ان کے سپرد کیں۔

جُزوِ دُوُم۔ اَدَب

کلامِ سلطان محمد قلی قطب شاہ

از

جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو

اُردو نے اگرچہ شمالی ہند یعنی گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا۔ لیکن وہ بات چیت، کام کاج، سودا سلف تک محدود رہی۔ اہلِ علم نے اُسے کبھی مُنہ نہ لگایا اور اس لیئے اُس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کلکھیڑ نہ اُٹھائی۔ سب سے اوّل ادبی صورت اُس نے دکن میں حاصل کی اور دکنی کہلائی۔ اور گردہِ عوام سے نکل کر مجلس خواص میں آئی۔ شعرائے دکن جن کی تخیل کی جولانگاہ فارسی زبان تھی، اب اس نئی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہے دکن کو اس کا فخر حاصل رہیگا اور اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہو گی۔

اس امر کو ہمارے ہاں کے اساتذہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی، ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

قائم کہتے ہیں ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اِس میں دکنی زبان کی اس قدر تنقیص مقصود نہیں جس قدر اپنی تعلی منظور ہے۔

ایک جگہ میر صاحب نے دکن میں اپنے شعر کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکھن کے بیچ
سر سبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ

ایک زمانہ تک یہ خیال رہا کہ ولی اُردو کا پہلا شاعر ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مگر تعجب ہے کہ باوجود غلطی تسلیم کرنے کے اب بھی بعض تذکرہ نویس ولی کو اُردو شاعری کا آدم کہتے ہیں۔ معلوم نہیں آدم سے اُن کا کیا مطلب ہے۔ اگر آدم سے مطلب وہ پہلا انسان ہے جو تمام بنی نوعِ انسان کا مورثِ اعلیٰ ہے تو یہ خیال صریحاً غلط ہے کیوں کہ ولی سے بھی پہلے دکن میں اُردو کے شاعر ہوئے ہیں۔ اور اگر آدم سے وہ پہلا انسان مراد لیا جائے جس کا علم ہمیں پہونچا ہے (گو ممکن ہے کہ اس سے قبل بھی انسان ہوئے ہوں مگر ہمیں اُن کا علم نہیں) تو بھی یہ خیال صحیح نہیں، کیوں کہ ولی سے پہلے جو شاعر ہوئے ہیں ہمیں اُن کا علم ہے اور اُن کا کلام بھی موجود ہے۔ غرض اس خیال کی نوبت عقیدہ تک پہنچ گئی ہے کہ جاننے اور سمجھنے کے بعد بھی قلم اور زبان سے نکل جاتا ہے۔

اِس کے بعد ایک دوسرا خیال قائم ہوا۔ جو اب تک صحیح سمجھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگرچہ ولی اُردو کا پہلا شاعر نہیں ہے تاہم وہ پہلا شخص ہے جس نے غزل کو فارسی رنگ میں لکھا ہے اور جس نے اپنا دیوان فارسی دیوانوں کے طرز پر ردیف وار مرتب کیا ہے۔ تحقیق نے جو غلطی کی گھات میں لگی رہتی ہے، پھر اس خیال کو نہ چلنے دیا۔ معلوم ہوا کہ ولی سے پہلے بھی شعرائے دکن نے اسی رنگ میں غزلیں لکھی ہیں اور مروجہ طرز پر ردیف وار اپنے دیوان مرتب کیئے ہیں۔

اس کا بیّن ثبوت سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلیات ہے۔ جسے آج ہم ناظرینِ اُردو سے روشناس کرنا چاہتے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ دسویں صدی ہجری کا شاعر اور اکبر کا ہم عصر ہے۔ جہاں تک تحقیق نے رسائی کی ہے یہ کلام اُردو میں سب سے قدیم ہے۔ بعض مذہبی مثنویاں اِس سے پہلے کی بھی پائی جاتی ہیں، لیکن تغزل کے کوچے میں کسی دوسرے مسافر کا پتہ اب تک نہیں لگا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی کلام اُردو کا نہیں ہے۔ اِس حد تک پہونچنے کے لیئے ضرور ہے کہ اس سے پہلے بہت سے عاشق مزاجوں اور موزوں طبع لوگوں نے مصرِ شعر کی کوچہ گردی کی ہو۔ اور اپنی مشاقی اور طبع آزمائی سے غزل، مثنوی، قصیدے اور دیگر اصناف سخن کو اس درجہ تک پہونچایا ہو جو ہم محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں دیکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن قابلِ قدر بزرگوں اور اُردو کے سچے محسنوں میں سے کسی کا کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ آیندہ جستجو اُنھیں ڈھونڈھ نکالے

اور ہمارے علم و تحقیق میں اضافہ کرے۔

وہ وقت بھی کیسا عجیب اور پُراسرار ہوگا جب کہ زبان پہلی بار تقریر سے نکل کر تحریر میں سماتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ کوئی لڑکپن سے نکل کر بلوغت کی سرحد میں اول قدم رکھتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آیا۔ خود اُسے بھی نہیں معلوم ہوتا جس پر یہ گزرتی ہے۔ وہ عجیب آن ہے جو نہ دیکھنے میں آسکتی ہے نہ بیان میں سما سکتی ہے۔ بعینہ یہی حال زبان کا ہے وہ آوازیں جو پہلی بار حروف میں منتقل ہوئیں ہمیشہ سے نظر سے پوشیدہ رہنگی لیکن زبان کا مؤرخ اس سے مایوس نہیں ہوتا۔ اگر نقشِ اوّل نہیں تو نقشِ ثانی تو کہیں ضرور مل رہیگا۔ ایک زمانہ وہ بھی ہوتا ہے کہ یہ دلکش انسانی آوازیں سینوں میں محفوظ رہتی ہیں اور ارثاً ایک نسل سے دوسری نسل کو پہونچتی ہیں۔ لیکن اُردو کو وہ بھی نصیب نہیں ہُوا۔ کیونکہ گیتوں کی زبان اُردو نہیں۔ اس لیئے ابتدائی اُردو سینوں میں نہیں سفینوں میں تلاش کرنی پڑے گی۔ چنانچہ دسویں صدی ہجری کی زبان کا پتہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے لگتا ہے۔

یہ کلیات ایک نہایت قابلِ قدر اور نادر نسخہ ہے بڑی تقطیع اور اعلیٰ درجہ کے قدیم کاغذ پر بخط نسخ بہت خوش خط لکھا ہُوا ہے۔ کتاب بہت ضخیم ہے تقریباً اٹھارہ سو صفحہ ہونگے۔ اسے محمد قلی قطب شاہ کے جانشین اور بھتیجے محمد قطب شاہ نے بڑے اہتمام اور خلوص سے ترتیب دیا ہے۔ یہ نسخہ شاہی کتب خانہ کا ہے اور سرِورق پر خود محمد قطب شاہ کے قلم کی لکھی ہوئی تحریر ہے (ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۳)۔ دونوں چچا بھتیجے صاحبِ علم، صاحبِ ذوق اور صاحبِ دیوان ہوئے ہیں۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ محمد قطب شاہ کی عادت تھی کہ کتاب پڑھنے کے بعد اُس پر ضرور کچھ نہ کچھ اپنے قلم سے لکھ دیتا تھا۔ چنانچہ اسی تصویر میں کلیاتِ جامی پر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اشعار کا فوٹو دیا گیا ہے۔ دونوں تحریروں کا ایک خط اور ایک قلم ہے۔ اس تحریر کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ فوٹو میں درج ہے اور اگرچہ عکس اصل سے چھوٹا ہے تاہم عبارت صاف پڑھی جاتی ہے۔ اس تحریر کے اوپر ورق کے سرے پر جو عبارت لکھی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خاص کتب خانہ شاہی کا ہے۔ ان دو عبارتوں کے درمیان محمد قطب شاہ کی مُہر ہے۔ مہر کی تحریر پڑھنا ذرا مشکل ہے اس لیئے وہ نقل کی جاتی ہے ؎

مُہرِ سلیماں زحق گشتہ مُیسّر مرا
گشت ز نقشِ نگیں حیدرِ صفدر مرا

اور ان دونوں مصرعوں کے بیچ میں "العبد سلطان محمد قطب شاہ" لکھا ہے۔ صفحہ کے آخر میں بائیں طرف کتب خانہ میں داخلہ کی تاریخ ہے اور اسی کے نیچے "تحویل نبی لعل نمودہ شد" تحریر ہے۔ اور اس کے نیچے خفی قلم سے "باقی الحال تحویل شمس الدین نمودہ شد" لکھا ہے۔ صفحہ کے اوپر کے حصے میں مہروں کی بائیں جانب کتب کی تعداد بھی درج ہے جس سے کتب خانہ کی حیثیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ کتب خانوں کی رونق صرف کتابت کے فنِ شریف پر منحصر تھی۔ کتابت کا سنہ خود قطب شاہ نے اپنی تحریر میں ۱۰۲۵ھ ہجری بتایا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب نے حیدرآباد فتح کیا تو شاہی کتب خانے سے بعض کتابیں بھی دوسرے مالِ غنیمت کے ساتھ دلی چلی گئیں۔ اور وہاں کے شاہی کتب خانہ میں داخل ہوئیں۔ اور جب دلی پر آفت آئی اور وہاں کا کتب خانہ برباد اور غارت ہوا تو یہ کتاب پھرتے پھراتے کلکتہ پہونچی اور کلکتہ سے آخر پھر اپنے اصل مقام یعنی حیدرآباد پہنچ گئی۔ صفحہ کے شروع میں جو یہ عبارت لکھی ہے "غزلیات محمد قلی قطب الملک کہ مشتمل است بر اشعار فارسی و دکنی از اموال عبداللہ قطب الملک در حیدرآباد داخل کتب خانہ سرکار شد"۔ اس کی شان تحریر سے صاف ٹپکتا ہے کہ یہ فدویانِ شہنشاہِ دہلی کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اور سرکار سے مراد سرکار شاہانِ مغلیہ ہے۔ حیدرآباد کی سرکار میں کوئی شخص محمد قلی قطب الملک اور عبداللہ قطب الملک کے نام بغیر آداب و القاب کے اس طرح بے تکلفی سے نہیں لکھ سکتا تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ باوجود ان حوادث و انقلابات کے یہ کتاب صحیح سالم بچگئی اور پھر وہیں آگئی جہاں سے گئی تھی۔

کتاب کے بے بہا، نادر اور مستند ہونے میں مطلق کلام نہیں ہوسکتا۔ صحت کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کتابت میں صحت کا امکان ہوسکتا ہے اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ خط بے نظیر ہے مگر نسخ ہے۔ کاتب نے بے شک لکھنے میں اپنا کمال دکھایا ہے لیکن یہ بزرگ عربی خط لکھتے لکھتے یہ بھول گئے کہ یہ ہندی کتاب ہے اور ہندی میں بعض حروف ایسے ہیں جو عربی میں نہیں اور جن کے ظاہر کرنے کے لئے خاص علامتیں ہیں۔ چنانچہ وہ بعض اوقات ڈ اور د، ڑ اور ر، چ اور ج، گ اور ک اور پ اور ب میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ ہندی کتاب کو نسخ میں پڑھنا ویسے بھی مشکل ہے اور جب رسم الخط کی دشواری بھی ہو تو مشکل اور بڑھ جاتی ہے۔ پھر جگہ جگہ دو لفظوں کو ملا کر اس طرح لکھ دیتا ہے کہ بغیر غور و فکر کے اس قسم کے لفظ صحیح نہیں پڑھے جاتے۔ اول تو زبان قدیم اور اس پر خط اور طرزِ تحریر

ں وقت، اِس لیئے جب تک پہلے سے کوئی زبان سے واقف نہ ہو، اس کا صحیح پڑھنا آسان کام نہیں۔

ہندوستان ہمیشہ سے پائمال السنہ رہا ہی، سنسکرت سے لے کر انگریزی تک کوئی نہ کوئی غیر زبان اس پر مسلط رہی۔ محمد قلی قطب شاہ کی حکومت گول کنڈہ میں تھی جہاں کی سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی اور رعایا کی زبان تلنگی۔ یہی حال عادل شاہیوں کا بیجاپور میں تھا کہ ملک کے آس پاس کی زبان کنڑی تھی۔ یہ دونوں زبانیں دراوڑی ہیں اور انہیں آریائی زبانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیئے ظاہر ہی کہ اس ملک میں جب اردو نے ادبی صورت اختیار کی تو اُس کے خط و خال کیا ہونگے۔ تلنگی اور کنڑی دونوں اجنبی اور غیر مانوس، ان سے کسی قسم کا میل ہو ہی نہیں سکتا۔ لامحالہ فارسی کا رنگ اس پر چڑھ گیا۔ اوّل تو فارسی آریائی، دوسرے صدہا سال کی ملی جائی یہ دونوں ایسی گھل مل گئیں جیسے شیر و شکر۔ تمام اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی، غزل اردو میں بھی بلا تکلف آگئے۔ الفاظ، تشبیہات، استعارات بنے بنائے تیار مل گئے۔ الفاظ کے ساتھ خیالات بھی داخل ہو گئے۔ اور قصیدے، مثنوی، رباعی اور غزل میں وہی شان آگئی جو فارسی میں پائی جاتی ہی۔ لیکن سب سے بڑا انقلاب جس نے اردو ہندی میں امتیاز پیدا کر دیا۔ وہ یہ تھا کہ عروض میں بھی فارسی ہی کی تقلید کی گئی ہی اور بغیر کسی تغیر و تبدل کے اُسے اُردو میں لے لیا۔ فارسی نے اسے عربی سے لیا تھا، اردو کو فارسی سے ملا۔ اگر اُردو (ریختہ) کو ادبی نشو و نما دکن میں حاصل نہ ہوئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ بجائے فارسی عروض کے ہندی عروض (پنگل) ہوتا۔ کیوں کہ دوآبہ گنگ و جمن میں آس پاس ہر طرف ہندی تھی اور ملک کی عام زبان تھی۔ بہ خلاف اس کے دکن میں سوائے فارسی کے کوئی اس کا آشنا نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ فارسی اس پر چھا گئی۔ ورنہ یہ جو تھوڑا سا امتیاز اُردو ہندی میں پایا جاتا ہی وہ بھی نہ رہتا۔ اور غالباً یہ اُردو کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔

میں نے ابھی لکھا ہی کہ اس کلیات کے شروع میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے ایک منظوم دیباچہ لکھا ہی۔ اس دیباچہ میں اوّل اس نے یہ بتایا ہی کہ ان نظموں کو کس ترتیب سے درج کیا گیا ہی۔ یعنی اوّل مثنویاں پھر قصیدے، اس کے بعد ترجیع بند، ترجیع بند کے بعد فارسی مرثیئے، اُس کے بعد دکھنی مرثیئے۔ دکھنی مرثیوں کے بعد فارسی غزلیں، فارسی غزلوں کے بعد دکھنی غزلیں، اور سب سے آخر میں رباعیات۔ اِس نے بعد وہ کہتا ہی ؎

بجد ہو کے طالبِ الٰہی نوّل ~~~ پرے شعر تا پائیں کر خط سگل

آپس دل میں کر فکر سب ایک ات — کئے خطبہ کہہ مستعد کلیات

جو الحق سنے کوئی اگر یو زباں — تو در حال کیں مرحبا بے گماں

سو کچ شاعری بیچ شہ دہر کمال — بچن کہہ کہ موتیاں نمن صدف ڈھال

کہے نین کہیں شعر میں وصف اپس — جو اچہ شعر کے فن میں اتیا سرس

جو بھی کوئی اچھے شاعر اس ڈھات دھاو — تو بن وصف اپس کے نرتے سا ود

اگر کم تو پچاس میں بیت چار — کہے باج اپس وصف سیتی سنگھار

رہیا جائے نا شاعراں منمنیں — بن آتے کہے صفت شعر کے فن منمنیر

جو خاصا ہی یو شاعراں کا ہر یک — نریں بن کہے وصف بتیاں کتک

اگر شاہ کہہ بیت پچاس ہزار — دھرے وصف آپس سوں کہن بیت چار

ونا شعر کہہ بیت میں نیک بات — کہی نین کہیں آپنے وصف سات

جو مقطع میں ہر یک اپس شعر کے — لیئے بن سو حضرت علی ناؤں اپے

نہ کرتے تھے ہرگز سو ختم کلام — بغیر از علی کا لیئے باج نام

کہے وصف شہ کا اگر تو جتا — تو ہے وصف میں شاہ کے کم و تا

تو اب ختم خطبے کوں ظلِّ الٰہ — کئے منگ علی ولی تھے پناہ

ظلّ اللہ، محمد قطب شاہ کا تخلص ہے۔ اس مقدمے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ اور علاوہ فارسی اور دکھنی کے تلنگی میں بھی اُن کا کلام ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ کہیں شاعرانہ تعلّی نہیں کرتے اور مقطع میں ہمیشہ تبرکاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام لاتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ خاص کر شعر و شاعری کے چرچے ایران

---

۱ کہیں ۲ کلام ۳ مانند ۴ نہیں ۵ اپنا ۶ اتنا ۷ کمال ۸ ہو یا رہے ۹ قسم، طرح ۱۰ نہ رہے ۱۱ کہے ۱۲ اتنا ۱۳ نام ۱۴ متنا ۱۵ مانگ

سے لے کر ہندوستان تک یکساں تھے بلکہ ہندوستان کا قدم کچھ آگے ہی تھا۔ شعر و سخن ہماری معاشرت و اخلاق اور ہمارے علم و فضل کا بہت بڑا جز تھے اور ہر شخص جو شرافت کا دعویٰ رکھتا تھا، شعر و سخن کا بھی مدعی تھا۔ شمال میں اکبر کے دربار میں ابوالفضل جیسے اعلیٰ انشا پرداز اور فیضی و عرفی سے زبردست شاعر موجود تھے جن کا کلام ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ اکبر نے ہندی کی بھی سرپرستی کی اور بیربر، تان سین اور خانخاناں کا ہندی کلام اب تک موجود اور مروج ہے۔ شاہانِ دکن نے فارسی کے ساتھ ساتھ دکنی (قدیم اُردو) کی بھی ویسی ہی قدردانی کی جو قدیم اُردو کے ابتدائی عروج کی پہلی بنیاد ہے۔ ہمارے بادشاہ صرف شعر و سخن کے قدردان و سرپرست ہی نہیں تھے بلکہ خود بھی شعرگوئی کا ذوق رکھتے تھے۔ اکبر اگرچہ اُمّی تھا مگر اس سے بھی بعض شعر منسوب کیئے جاتے ہیں۔ یہی حال دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کا تھا۔ تاریخوں میں ان بادشاہوں کے نام سے بھی اشعار درج ہیں۔ لیکن ان میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نمبر سب سے اوّل تھا۔ اِس کے کلام کا مجموعہ اس قدر ضخیم ہے کہ بادشاہ شاعر تو کیا پیشہ ور شاعر بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

جو لوگ فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں اور جن کے ذوق کی بنیاد ایرانی شاعری اور بعد کے اُردو کلام پر ہے، انہیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں خیالات کی جدّت، استعارات و تشبیہات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی، بندش کی چستی نظر نہیں آئیگی۔ نہ انہیں الفاظ کی نشست اور ان کی باہمی ترکیبوں میں کوئی خوبی معلوم ہوگی۔ اور نہ طرزِ ادا میں (جس پر کلام کی خوبی کا بہت کچھ انحصار ہے) کچھ زیادہ لطف آئیگا۔ اس میں سراسر شاعر ہی کا قصور نہیں، پڑھنے والے کا بھی ہے۔ اِس کے پڑھتے وقت یہ بات نظر انداز نہیں کر دینی چاہیئے کہ یہ اُردو کا قدیم اور ابتدائی کلام ہے جس کے قبل کا کوئی کلام ہمارے پاس نہیں ہے اور اگر ایک آدھ چیز ہے بھی تو وہ بھی کم و بیش ایسی ہی ہے۔ دوسرے اس کی زبان اُس وقت کی ہے جب کہ اُردو نے میدانِ ادب میں پہلا قدم رکھا ہے۔ اس لیئے نہ صرف زبان کی صورت شکل میں ہی فرق ہے بلکہ طرزِ ادا میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ دکن میں ہندی نے جب ادبی صورت اختیار کی تو فارسی کے سانچے میں ڈھل گئی، لیکن بہت سے ہندی الفاظ اور ہندی ترکیبیں اور بعض ہندی خصوصیتیں ویسی ہی باقی رہیں۔ اُس وقت کے ادیب اور شاعر نے دو دریاؤں کو جو مختلف سمت میں بہ رہے تھے ایک نہر کھود کر لا ملایا اور یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور ایرانی عشق کے

پہلو بہ پہلو ہندی پریم کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ صورت ایک ہی مگر جلوے دو ہیں، بات ایک ہی مگر مزے دو ہیں۔ بعد میں جو ادیب اور شاعر آئے جو مئے شیراز کے متوالے تھے، انہیں جو چیزیں اجنبی اور غیر مانوس اور اپنے ذوق کے خلاف نظر آئیں، وہ انھوں نے چُن چُن کر پھینک دیں اور بجائے ہندی کے فارسی عنصر غالب آگیا اس میں ولی اور اس کے ہم عصر بھی ایک حد تک قابل الزام ہیں۔ اس زمانہ میں مولوی حالی ایک ایسے شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے اُردو میں ہندی کی چاشنی دے کر کلام میں شیرینی پیدا کردی مگر ہم عصر شعرا میں اس کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ غرض سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے وقت ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے کیوں کہ قدامتِ زبان اور طرزِ ادا نے اُس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور جب تک اُس زبان سے پوری واقفیت نہ ہو، اس کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ شاعر کا یہ کچھ کم کمال نہیں ہے کہ اس نے ایک ایسی زبان میں جس کے منہ سے اُس وقت تک دودھ کی بو نہیں گئی تھی، اُن خیالات کا اظہار کیا ہے جس کی صلاحیت فارسی میں صدہا سال کے منجھنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اگر زبان کی قدامت کا پردہ حائل نہ ہو تو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہمارے ہاں کے اوسط درجہ کے شعرا سے کسی طرح کم نہیں۔ میں یہاں چند شعر نقل کرتا ہوں جن میں زبان کی دقت کم ہے، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

کفر ریت کیا ہور (اور) اسلام ریت
ہر یک ریت میں عشق کا راز ہے

عشق کا رتبہ کس قدر بڑھا دیا ہے اور اس بلند مضمون کو کس سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ شعر اُردو کے اچھے اور منتخب اشعار کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

چند اشعار اور لکھے جاتے ہیں۔

بنتی کہو پیا کوں ہم سیج کی نہ آوے
اُس باج منج گمے نا منج باج کیوں گماوے

(بنتی = منت سماجت۔ گمنا = وقت کاٹنا، بسر کرنا۔ کی = کیوں)

مطلب یہ ہے کہ پیا سے منت سماجت سے کہو کہ میری سیج پر کیوں نہیں آتا۔ مجھ سے تو ایک دم بغیر اُس کے بسر نہیں ہوتی

وہ میرے بغیر کیونکر بسر کرتا ہے۔

زہد ریا تھے بہو دن بدنام ہو رہیا ہوں
پیالے پلا پرم کے کرنیک نام ساقی

(تھے = سے - بہو = بہت - پرم = پریم - محبت -)

تج بن رہیا نہ جاوے ان نیر کچ نہ بھاوے
برہا کتا ستاوے مَن سیتی مَن ملا دو

(ان = غذا؛ نیر = پانی؛ برہا = فراق - کتا = کتنا)

رقیب کا ہے کو کرتا ہے ہم سوں کچ بحثاں
قبول ظلم و جفا ہے جو آے جاناں تھے

(تھے بمعنی سے)

جیکوی ہے عشق میں ثابت سدا ہی جیونا اُس کا
سو اُس کے ناؤں سے میخانہ سب معمور کرسانی

(ناؤں = نام - جیکوی = جو کوئی)

رقیباں منے جا بلانے نہ بھیجے؛ کہو اِس بلانے کو کیا ناؤں ہے
رہے پانوں دل سوں چلوں تیری پنتھ کہ اس پنتھ چلنے کو دل پانوں ہے

(پنتھ = رستہ، طریقہ - منے = تئیں، پاس)

بنو جی قدر پیو کا وصل کی دیس سزا اُس برہ کی راتاں میں پائی

(دیس = دن - برہ = ہجر)

تمہارا میا ہونا منج چوک اوپر کہ میں بالی ہوں ہور ناداں بچاری
اونیندی ہے مج نین تج یاد سیتی کہو تم نین میں ہے کاں کی خماری

(اونیدی = بے نیند کے۔ میا = محبت۔ کاں = کہاں)

(یعنی، میری آنکھوں سے تو تیری یاد کی وجہ سے نیند اُڑ گئی، مگر تیری آنکھوں میں جو خمار بھرا ہوا ہے یہ کہاں کا ہے)

اِن اشعار سے جو صاف اور سادہ ہیں، قلی قطب شاہ کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ قدیم زبان سے واقف ہیں اُنہیں اس کا خاص لطف آئیگا۔ میں نے حتی الامکان ایسے اشعار دیئے ہیں جو زبان کے لحاظ سے بھی صاف ہیں۔ ایسی ہی ایک غزل کے چند اشعار لکھتا ہوں۔ زبان اور مضمون کی سادگی اور اس کے ساتھ شوق، درد اور گھلاوٹ ملاحظہ ہو ؎

پیا باج یکتل[1] جیا جائے نا ۔۔۔ پیا باج پیالا پیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں ۔۔۔ کہیا جائے اتا کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کور ہے ۔۔۔ کدھیں[2] اُس سے مل بیسیا[3] جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند ۔۔۔ دوانے کو کچ پند دیا جائے نا

اگر دو ایک شاعروں کو مستثنےٰ کردیا جائے جن کا درجہ درحقیقت نہایت بلند ہے، تو ہمارے ہاں کی عشقیہ شاعری میں کوئی بات نئی نہیں نظر آتی۔ چار سو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کے شعرا کے عشقیہ کلام کے سامنے رکھ دیا جائے تو سوائے زبان کے تغیر اور شستگی کے کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔ وہی باتیں ہیں، وہی مضمون ہیں اور وہی طرز ادا اور وہی بحریں ہیں۔ اس لحاظ سے سلطان قلی قطب شاہ کا کلام اُردو کے کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں ہے۔ عشق و مستی اور تصوّف میں اس کا کلام کسی سے پیچھے نہیں۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظؒ کے فیض نے شاعر کی طبیعت کو گرما دیا ہے۔ چند شعر بطور مثال کے یہاں نقل کیئے جاتے ہیں ؎

یوں آج دِستا[4] ہے سکی[5] اس وقت کا مصلت[6] منجے ۔۔۔ جا بیٹھوں گا میخانے میں اُس ٹھار[7] ہے عشرت منجے
پیالا پرم کا ہاتھ لیوں دو جاں کے سنگ تھے دور ہوں[8] ۔۔۔ ہے خوب جیچ[9] جگ منے سو ہے سدا دولت منجے

پلا سا قیا مجکوں مستانہ مے ۔۔۔ کیا ہے بہوت گرم چنگ ہور نے
جیچ[10] عشق کوچے میں ہے سلطنت ۔۔۔ نہیں دیکھیا ہے کدھیں اس کو کے

---

[1] یکتل، ایک دم، ایک لحظہ [2] کدھیں، کبھی [3] بیسنا، بیٹھنا [4] دکھائی دیتا ہے [5] سکی [6] مصلحت [7] جگہ بمقام [8] ہوں [9] جو کچھ [10] جو کچھ

سدا پھولین اور نڈ ہے بنجے   نہیں ہے خماری کہیں ہور دے
سپٹنور ہے تج جوت سوں سب جگت   نہیں خالی ہے نور تے کوئی شے

زہد ریا تے ہو دن بدنام ہور ہیا ہوں   پیالے پلا پرم کے کر نیک نام ساقی
مستی تے اپ صراحی کرتی تمی سرکشی   کرتی ہے جام کو اب ہر دم سلام ساقی

اب مست اچھے دائم ہیں مست اچھنے کا ہنگام ہے   ساقی صراحی نقل ہور پیالے سو ہنا کام ہے
عاشق اول تے ہیں ہیں سرمست ازل تھے ہیں   نا آج کل تے ہیں ہیں زاہد کو نیں یہ فام ہے
روز نید کے عید آنے میں ٹک شیر خرماں کھاؤ نیں   صوفی چلے میخانے میں تسبیح ہات اب جام ہے
منگتا ہے مستاں کنے مدباج نیں سکتا رہنے   میخانے کے کوچے منے تو متقی بدنام ہے
ساقی پیالا منج پلا پیالا پینے ہوتا دلا   اُس پیو کوں تو لیا کر ملا جس پیو تے مج آرام ہے

قطبا نبی کے ادھار تے رحمت ہے نت کرتا رہے
تو تج علی کے پیار تے تلیش نوا انعام ہے

گرجا ہے میگھ سر تے تازہ ہوا ہے بستاں   پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صباتوں نج جا جواں قداں کن   چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
او نونہال پھولاں ہے جام خوسے سو بادہ   نرگس اپس پلک سوں جھاڑو کرے شبستاں
کھ نور پردے یوں مج خط عنبریں دا   جوں سور اپر ہے بادل ریحاں سوں گلستاں
بیہوش میرے دل کوں مٹھے ادہر علاوا   گلزار ہے عجب او دو لعل شکرستاں

---

۱ شراب ۲ ماہ کامل ۳ اچھنا = ہونا یا رہنا ۴ نہر ۵ روزِ عید ۶ میں ۷ چاہتا ہے ۸ مدد، حمایت، ۹ ہردم، ہر آں ۱۰ پھر سے، از سرِ نو ۱۱ باس ۱۲ اپنی ۱۳ لب

مج عشق کے گداکوں اورنگِ شاہی دیتا   سب عاشقاں منج انگے ہیں طفل جوں دبستاں

روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالا

بھرلے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خمستاں

ایک رباعی ہے۔

مستی کے مُلک میں ہے جہانبانی منجے   خوباں کے دکھن میں ہو مُسلمانی منجے

خمار کا خم خانہ اہے ٹھانوں میرا   ہر مد کا سبو بند نگیں سلیمانی منجے

ایک دوسری رباعی ہے۔

کب لگ اچھے لب پہ زہد دل میں جام   اس پاپ سوں بھریا سو زہد منج کیا کام

مد کے مدے لیا و جو صفاتیں ہیں تمام   یک پختہ برابر نہیں ہے سو لک خام

غرض اس قسم کے سینکڑوں شعر ہیں جن میں مستی اور مے نوشی صاف بہتی نظر آتی ہے۔ یہ سب فارسی شاعری کا طفیل ہے جس کا چربہ شاعر نے اپنی زبان میں اُتارا ہے۔ یہ رنگ بہت خوب ہے مگر فارسی میں ضرورت سے زیادہ شوخ ہو گیا ہے۔ ذیل میں ایک غزل کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔ اِن سے شاعر کے زورِ کلام اور قوتِ بیان کا بہت اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یک ایک ہی ہر ٹیک کد من لاکھ چمن ہے   لکھ جوت ہی ہر ٹھار دسے ٹیک رتن ہے

سمد رہے یک بوند (ایک) ندیاں ہیں سو ہزاراں   باتاں سو کروڑاں ہیں دسے ٹیک رتن ہے

کس ٹھار میں دستا نہیں سب ٹھار رہی بھرپور   دکھن کو سکت کاں اسے ہر ٹیک نین ہے

منج عشق گری آگ کا یک چنگی د سورج   اس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ہے

ا آئے ۲ بوند ۳ یک ۴ مطلب یہ ہے کہ شراب کے مقابلہ میں جتنی عمدہ صفات ہیں لاؤ تو دیکھو گے کہ جس طرح ایک پختہ خیال کے مقابلہ میں سو لاکھ خام خیال کچھ حقیقت نہیں رکھتے اسی طرح ایک شراب کے سامنے لاکھوں صفات ہیچ ہیں۔ ۵ کدمن۔ طرف، سمت ۶ سمد۔ سمندر

اُس کے سو پرتؔ پنتؔ میں چل تیں سوں قطبا   تجکوں سو مددگار حسین اور حسن ہے

کیا یہ اشعار اپنے خیال اور [illegible]رتِ بیان میں حال کے کسی شاعر کے کلام سے کم ہیں؟

علاوہ اُن خوبیوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جو ہمارے شعرا میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ایک بات نئی دیکھی گئی ہے جو اُردو شعرا میں سوائے سوؔدا اور نظیرؔ کے کسی دوسرے کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ ہے کہ اُس نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت، حمد و نعت، منقبت و مرثیے تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہرِ قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے۔ مثلاً متعدد مثنویاں، پھلوں اور میووں پر ہیں جن میں ایران اور خراسان ہی کے میوے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر قسم کے پھلوں کا بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بڑکی بڑولی، بنولی، انباڑا، منجلؔ، گینگلؔ، سیندؔولے کو بھی نہیں چھوڑا۔ ایک مثنوی سبزی ترکاری کے بیان میں ہے جس میں دھنیئے، ادرک، لہسن تک کا ذکر ہے۔ اِسی طرح ایک مثنوی شکاری پرندوں کے بیان میں ہے۔ علاوہ اِن کے بہت سی مثنویاں اور غزلیں ایسی ہیں جو شاعر نے اپنے محلات (الٰہی محل، باغ محمد شاہی، دادمحل، اعلیٰ محل، حناں محل) اُس وقت کے رسم و رواج اور تیوہاروں مثلاً شادی کے رسوم، اپنی سالگرہ، شب برات، میلادنبی، عید خم غدیر، سوکؔا، برسات، ہولی، بسنت، پان اور اپنے ہاتھی پر لکھی ہیں۔ ایک مکالمہ صراحی و پیالہ پر اور دوسرا کالی گوری پر لکھا ہے۔ یہ بھی دونوں مثنویاں ہیں۔ اگرچہ یہ مثنویاں معمولی ہیں اور شاعری کے لحاظ سے اعلیٰ رتبہ نہیں رکھتیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ گو اُس نے فارسی شاعری کا پورا اتباع کیا ہے مگر اس کی نظر وسیع تھی اور وہ عشق و محبت کے تنگ کوچہ سے باہر نکل کر صنعت و قدرت کی خوبیوں کی داد دے سکتا ہے۔ اِس لحاظ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ بحیثیت شاعر کے خاص امتیاز اور وقعت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف پہلا شاعر ہے جس نے اُردو میں غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ لکھا بلکہ اس نے حلقۂ تقلید سے باہر نکل کر جس میں اُردو شاعری ابتدا ہی سے مقید ہو گئی تھی، کسی قدر آزادہ روی اور جدّت کا مسلک اختیار کیا اور اپنے مشاہدہ کو کام

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴) ۶؎ رسن = زبان؛ ۷؎ دستا = دکھائی دیتا؛ ۸؎ کان = کہاں؛ ۹؎ چنگی = خچگاری؛ ۱۰؎ گگن = آسمان

۱؎ پرت پنت = راہ و محبت ۲؎ سیں = سر ۳؎ ایک قسم کا سن ۴؎ آڑو کا پھل ۵؎ ایک چھوٹے سے پیڑ کی جڑ ہے جسے حیدرآباد میں شیخ میوہ بھی کہتے ہیں۔ ۶؎ سیندھی کے درخت کا پھل ۷؎ سُرمہ کا وہ خط جو عورتیں آنکھ سے لے کر زلف تک کھینچتی ہیں۔

یں لاکر ایسی چیزوں پر نظمیں لکھیں جس سے اُردو کے بعد کے شعرا بھی قاصر رہے۔

حمد و نعت، منقبت، مناجات نیز دیگر مضامین پر بہت سی مثنویاں لکھی ہیں۔ اُن کے نمونے دینے سے مضمون بہت طویل ہو جائیگا۔ قصائد بھی بہت لکھے ہیں۔ ان کا ایک آدھ نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

باغ محمد شاہی کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں سے یہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

محمد نانوں تے بستا محمد کالے[1] بن سارا	سو طوباں سوں سُہاتا ہے جنت نمنے چمن سارا
دِسے فانوس کے درمیانے تے جوں جوت دیوے کا	سو تیوں دِستا دِوَلاں میں تھے میویاں کان[2] برسارا
ہے دم عیسوی انم چمن میں گل لگانے نت	ہرے نہالاں کے جلوے تیں مشا طا ہو یوں سارا
سڑک سے باغ کوں نکہت کھلے منج باغ کی غنچے	سو اُس غنچے کے باساں تے لگیا جگ مگن[3] سارا
چمن کے پھول کھلے دیکھ سکیاں کا مکھ یاد آیا	سُہاتا تھا[4] محمد پھل نمن[5] اُن نین سارا
دِسے ناسک[6] کلی چنپا بھنوار دپات میں تسکے	بھنور تل دیکھ اس جا کا ہوا حیران من سارا
سو خوشے داکھ[7] لاکھاں کے ثریا سنبلا ہے جوں	سُہے اُس داکھ منڈوا سو جیسا سبز کہن سارا
اناراں میں سُہے دانے سو جوں یاقوت تبلیاں میں	ہر ایک پھل اُس اناراں پر سہے سکے من سارا
کھجوراں کے دسیں جھونکے[8] کہ جوں مُرجان کے پنجے	سپاریاں لعل خوشے جوں دسیں دن ہور رین سارا
دسیں ناریل کے پھل یوں نر مرد مرتباناں جوں	ہور اُس کے تاج کوں کہتا ہے پیالا کر دکھن سارا
دسیں جاموں کے پھل تن میں سلیم کے نمن سالم	نظر لاگے تیوں میویاں کوں رکھیا ہے جتن سارا

صفت کرنے کوں سوسن بی[9] کھلیا ہے وزبان اپنے	دکھن سب سندریاں کی تیں کھلیا نرگس نین سارا
چمن آواز سن بلبل الیس میں آپ لاپیں ہیں	سو تس آواز سوں موراں کریں قصاں اپن سارا

---

[1] اے۔ یہ [2] برن = جسم [3] کملانا = جگمگانا [4] زیب دیتا تھا [5] مانند
[6] ناک [7] انگور [8] گچھے
[9] بھی

دکھتُ رکھ مست ہو دستک بجاویں پات ہاتاں سوں[51] — سوڈالیاں ڈُلتے ہو متواں ہیں پھول برہن سا را

مگر شبنم کا مے ہی یا اُدھر جلاّب کا پیالا — یو بی خوب ہور او بی خوب تجھوں ل پون سارا

اُمنگاں آپ اُمنگاں سوں اپسیں آپ ل ناچیں — تمنّا کا تمن ناچیں ہوئے تن تن تمن سا را

قصیدہ منقبت کی تشبیب کے چند شعر ذیل میں نقل کیئے جاتے ہیں۔

آج شہ چیں چلیا شرق نگر تھے شتاب — ڈھال فلک کی اُچا[52] او شہ عالی جناب

باند خنجر کرن کی زرّیں فرنگ ہات لے — صبح کے وقت آٹیا پیک[53] دو پیالی شراب

چرک[54] فلک فیل مست مستی سوں مکھ لال کر — گرم ہو چلنے لگیا دن لے کنک[55] بے حساب

ذتے ہو فراش سب چلیئے شہ چیں آگے — دیتے سر اپنے شفق لا اُسے زریں طناب

قوس و قزح ہات لے جوڑ کہ[56] تیر استوا — سور کشش جو کیا اُس کہ اُڑانے غراب

سو ہی غلط یوں نہیں ہی قضیا یوں تھا سُن — فتح و ظفر چند کا چیخ دیا اُس جواب

شاہ ختن سُن چلیا غرب نگر تھے لے فوج — تنکے تاناں ریں رنگ جیسے اہے شکناب

کش کہ چلیا ہات قوس اُسے اسماں کی — سور یا تارن کوں تیں جوڑ یا ستارے شہاب

جب آپس میں اُن کی (چاند سورج کی) جھڑپ ہو گئی تو

اتنے میں دیتا اہے صلح خدا ان منیں — ہی تمیں نس[57] دن کی شہ نا لڑو تم اتنے باب

میں کیا تم دو کوں شاہ یک سرج ہو ٹیکا — دھرتی تمیں دونو ماہ دونوں کوں سر پر ہی داب

دن کو سُرج نس کو چند تدمی کیا ہے ذہاب — چاند کوں کنیا ممی سور کوں کتیا ذہاب

تیر خیات" (فلکیات) پر متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ ایک اور قصیدہ منقبت میں لکھا ہے اُس کی تشبیب بھی اسی قسم کی ہے اور شروع سے آخر تک طرح طرح کی تشبیہات میں سورج چاند اور ستاروں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ شام کو

---

٥١ لعاب لب — ٥٢ اُچا = بلند کیا (اُچانا فعل سے) — ٥٣ پیک = پی کے

٥٤ چرک = چڑھ کے (عربی خط کی وجہ سے مسخ ہو گیا ہے) — ٥٥ کنک = فوج

٥٦ جوڑ کہ = جوڑ کر — ٥٧ نس = رات

سمندر قرار دیا ہے جس میں سونے کی کشتی ڈوبتی ہے اور اُس کے ڈوبنے سے لاکھوں کروڑوں بُلبُلے نمودار ہوتے ہیں اور یہی ستارے ہیں جو آسمان پر چمکتے ہیں۔ شعر یہ ہے ؎

بن کے سمند سیام میں سنے کی روزق ڈبیا — ڈبنے میں ترنے لگے بڑبڑے کے لکھ ہزار

دوسری جگہ سورج کو یوسفِ فلک سے تشبیہ دی ہے کہ مغرب کے کنویں میں اُس کے ڈوبتے ہی زمانہ میں یعقوب کی آنکھوں کی طرح اندھیرا چھا گیا ؎

غرب کے چہ میں پڑیا یوسفِ انبر کا ہور
جگ سہیں یعقوب کے نین نمن اندکار

دوسری شعر میں کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ بجھ کر گلشن ہو گئی اور یہ اندھیرا جو دنیا میں نظر آتا ہے وہ اسی آگ کا دھواں ہے ؎

آگ براہیم کا بجک ہُوا پھول بن
رین سو تِس آگ کا ہے دھنو کیا دھندکار

دوسری جگہ کہتا ہے کہ چاند سکندر کی طرح رات کی ظلمات میں چلا جا رہا ہے اور تارے اُسے رستہ دکھانے کے لیئے شمع کا کام دے رہے ہیں ؎

چند ہو سکندر چلیا رین کے ظلمات میں
شمع دیپک مشعلاں روشن ہوے اُیار

ایک جگہ لکھتا ہے کہ سورج نے چرخ کے خم خانے میں گھس کر اس قدر شراب پی لی کہ بدمست ہو کر مغرب کے چشمہ میں جا پڑا ؎

چرخ کے خم خانے میں سور پیا جا نو مد
مست ہو جا کر پڑیا غرب کے چشمے منجھار

ایک دوسرے شعر میں آسمان کو لگن سے چاند کو شمع سے اور تاروں کو پتنگوں سے تشبیہ دے کر کہتا ہے کہ تارے سوزِ عشق سے بے تاب ہو کر چاند کی شمع پر قربان ہو رہے ہیں ؎

کھن ہے لگن، شمع چاند، تارے تپنگ کے نمن

اُڑتے ہیں اُس آس پاس عشق تے بے اختیار

آگے چل کر آسمان کو حوض بتایا ہے جس میں رات پانی کی طرح بھری ہے۔ چاند اُس کا فوارہ ہے اور تارے بوندیں ہیں

کھن کے سو حوض خانے میں رین بھریا نیر جوں

چاند پھویارا منن تارے بنداں نیر سار

غرض اسی طرح کی بیسیوں تشبیہیں دی ہیں اور جب سب تشبیہیں ختم ہو گئیں اور کوئی اور نہ ملی تو آسمان کو مدرسہ بنایا۔ چاند اُس میں مدرس بنے اور تارے طالب علم ہوئے جو مدرس سے بحث کر رہے تھے۔

کھن کے مدرسے منے چاند مدرس سکنے

بحث کرن تارے آئے طالب علماں کے سات

ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے علاوہ غزلوں کے مختلف مضامین عشقیہ اور غیر عشقیہ پر مثنویاں اور قصیدے لکھے۔ اسی طرح وہ پہلا شاعر ہے جس نے واقعۂ کربلا کے متعلق پردرد مرثیئے اور نوحے تحریر کیئے۔ نمونہ کے طور پر ایک نوحہ لکھا جاتا ہے

دو جگ ماماں دکھ تے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن پو ش کی لکڑیاں جلا کر کرتی ہیں خواری وائے وائے

ساتو لگن آٹھو جنت ساتو دریا ساتو دھرت
اکیس تے ایک آپس میں آپ دکھ کرتے کاری وائے وائے

کالا ایک کسوت ہکا دیکھو ماماں دو تک تے
ظلمات بی کالا ہوا اس دکھ تے بھاری وائے وائے

لوح ہور قلم کرسی عرش قدسیاں ملک غلماں سب
بجلیاں بدل ارڑ روتے ہیں رات ساری وائے وائے

اسماں جمع جلا ہوا سورج اگن والا ہوا
چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے

پنکھی ہٹے ہیں سب پراں رو رو بھرا سے سمدراں
چھوٹے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو تو زاری وائے وائے

---

۱ روداں ۲ جل کر ۳ ساتوں ۴ آٹھوں
۵ دکھ ۶ بی ۷ بدلے، عوض
۸ چلاتے ہیں

کالے ہوئے دکھ تے منگل سر پر سٹیں ماٹی سگل — تو پکڑے اس دکھ تے جنگل ہے بیقراری والے

پھولاں سکے[1] سب دکھ ستی مکھ موندے بلبل جھکھ ستی — کوئل جینا دکھ ستی بن بن پکاری والے

دیکھو تمیں اسے مانساں[2] دانے چریں نا پنکھیاں — دھرتی ہے ماتم کی دکھاں دھرتی بچاری والے

دو جگ خراباں ہو رہے حیواں کباباں ہو رہے — سمدر سراباں ہو رہے ناہوے جاری والے

دکھ آگ سوں جگ بن جلے آکاس تا دھرتی ہلے — گگن پر فرشتے کھلبلی سٹ اختیاری والے

حضرت نبی کے گیسواں دو اماماں کے پکاں[3] — جبریل جھلاوے اپ ہتاں[4] آرات ساری والے

حضرت علی کے دو پتاں[5] کاندھے نبی کرم انیاں — تس پر چڑھے دو شہ جواں اس ہات ساری والے

شہزادے کے سب[6] اوناں سنے پکارے اس زماں — عفعف بنی تنکوں سناں کے دو باری والے

جبریل آکر کہے تسری براں[7] جو عف سکے — اس عفو تے جگ پاسے سب رستگاری والے

دو نور دیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکھ دکھے — لہو میں لڑے پیاسے جھکے دیکھو یہ خواری والے

یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر — کافر کیئے کیسے قہر یوں زخم کاری والے

دکھ بات کو توجیب جلے لکھنے قلم بی نا چلے — دل جیوں شیشے[8] جل تلملے سد کی بماری والے

قطبا کہے دل کے بچن ہر دم مدد پنج تن — راکھے خدا منجکو جتن دشمن کو خواری والے

قطبا کو ہے اللہ مدد بستا ہے اس دل میں احد
تو پنج مدد حیدر دلبریاں کو زاری والے

اوپر جو نمونے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے پیش کیئے گئے ہیں اُن سے فارسی شاعری کا اثر صاف ظاہر ہے۔ خیالات وہی ہیں، استعارات اور تشبیہات پر بھی وہی رنگ غالب ہے اور بحریں بھی فارسی ہیں، لیکن باوجود ان تمام اثرات کے ایک بات خالص ہندی ہے جو اس کے کلام میں شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔ یعنی بخلاف فارسی شاعری کے عورت کی طرف سے عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ مرد کو بے وفائی کے

---

[1] سوکے [2] لوگو [3] پنکھیں [4] اقوں
[5] بیٹے [6] مانند [7] تیسری بار [8] شیشہ

طعنے دیتی ہے۔ سوکن (رقیب عورت) کی طرف سے بدگمانی اور رشک ظاہر کرتی ہے۔ برہ کی راتیں بے قراری میں کاٹتی ہے۔ غرض وہ عاشق ہے اور مرد معشوق۔ یہ ہندی شاعری کا رنگ ہے جو شاعر نے اپنی اردو شاعری میں قائم رکھا ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے جہاں گیر کے دربار کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ "ایک موقع پر جہاں گیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی ایک غزل گا رہا تھا اور بادشاہ اُس کو سُن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ جب قوال نے یہ یہ شعر گایا ؎

تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ دفعتہً بگڑ گیا اور قوال کو فوراً اٹھوا کر نکلوا دیا اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور فوراً ملا نقشی مہرکن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا، بُلا کر لائے تا کہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیما کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا، حضور خیر باشد بادشاہ نے کہا دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے غیرتی کا مضمون باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ ملا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اُسی وقت بادشاہ کا غصہ فرد کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشو و نما پایا تھا اس لئے وہ اکثر ہندوستان کے اصول کے موافق شعر کہتے تھے۔ یہ شعر بھی اُنہوں نے اُسی طریقہ پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیوں کہ اب تک تیری آنکھوں میں نشہ کا یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بجانا ہونے لگا۔"

اس قسم کے ہزاروں شعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

پیا کس سے گمائی رات ساری
تن انکھیاں میں پائی میں خماری

یہ بالکل امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔
ایک دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

گما کر ین د و تی سے چھپا تے — میں بوجی ہوں نشانیاں سب ین کے
کھو رات کن سات کیتی ہیں با تا ں — کہ چوتا ہی تم میں تے رنگِ خماری

غرض اس قسم کے اشعار سے سارا دیوان بھرا پڑا ہی اور اس سے ہندی شاعری کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہی اور بجائے ہمدم و مونس کے سکی (سکھی) سہیلی اور ساجن اور بجائے رقیب کے دوتی، دتن اور پریم، نیہ، پرت اور برہ کے الفاظ ہمارے قول کی تصدیق کرتے ہیں ؎

تری نیہ کا منجکو بچھو لڑیا — میرے سبھی تن میں لس اس کا چڑیا
میں آئی تج پاس اتارا کرن — تمیں کرن ہارا اُتارا پیا
جو دیکھی میں اُس روپ ونتا سجن — نین اُس سلونے تے پھر لس چڑیا

نوازیں آپ میا سیتیں توں مجکوں — کہ میں باندی ہوں تج سوں حُب سارا

نکو ہو نکو ہو سہیلی کھیلی — تجے شہ کریں گے میا سوں نہالا

تمیں میرے مندر سو آج آؤ لالا — تم اوپر تے واروں گی جوبن بالا

اگر سلطان محمد قلی قطب شاہ جہانگیر کے زمانے میں ہوتے اور وہ ان کا کلام سن پاتا تو کچھ تعجب نہ تھا کہ طیش میں آکر اُس کے ملک پر چڑھائی کر بیٹھتا۔

بعد کے اُردو شعرا پر فارسی شاعری کا رنگ ایسا غالب آیا کہ یہ خصوصیت اُردو شاعری سے بالکل اُٹھ گئی اور رفتہ رفتہ بہت سے ہندی الفاظ بھی زبان سے خارج ہو گئے۔ اور اُستادی الفاظ کے متروک کرنے میں رہ گئی۔

علاوہ ہندی شاعری کی اس خصوصیت کے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ہندی زبان کی بعض اور خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں اور الفاظ تو بکثرت ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حمد و نعت و منقبت میں بھی ہندی

کے مذہبی الفاظ استعمال کرتا ہی۔ مثلاً

کروں ابتدا حمد کرتار کا　　　کہ منعم ہے کرتار سنسار کا

کہوں حمد اُس حی سُبحان کا　　　دیاونت داتار دیان کا

وہی رب نرنجن ہے لاریب فیہ

کہ توہیں اَہے سب جگت کا گُسائیں

دُنیا بسے لگ سدا انندسوں نبی علی کے سو صدقے جگت میں　　　اہے قطب شہ کہ داس ہے وہ علی ولی شاہ مرتضےٰ کا

ہندی زبان میں ترکیب کی ایک صُورت یہ بھی ہی کہ دو اِسم مِل کر ایک لفظ بن جاتے ہیں۔ اس کی کئی صُورتیں ہیں۔ مثلاً بعض وقت دونوں اسموں کے درمیانی حروفِ علت حذف ہو جاتے ہیں۔ جیسے نگھٹ پت جھڑ۔ کبھی پہلے اسم کا آخری یا دوسرے اسم کا پہلا حرفِ صحیح ساقط ہو جاتا ہی جیسے لوچوں۔ پھَلیل (پھول تیل سے) بعض اوقات دونوں اِسم اپنی اصلی حالت میں رہتے ہیں اور کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی اور یہ ترکیب بغیر کسی حرفِ ربط یا اضافت کے استعمال ہوتی ہی۔ جیسے تِلی گھر، کرن پُھول، اَن داتا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں آخری قسم کی ترکیب بہ کثرت پائی جاتی ہی۔ اس میں اُنھوں نے صرف ہندی الفاظ ہی کی پابندی نہیں کی بلکہ عربی فارسی کا استعمال بھی اسی قاعدہ کے مُطابق کیا ہی۔ مثلاً

قطبا کو ہی اللہ مدد، بستا ہی اس دل میں احد

یا

جنت حور ہے یا پری استری

لیکن کمال یہ کیا ہی کہ ہندی کے ساتھ فارسی عربی الفاظ بلا تکلف ملا دیئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ جگت توح تھے کفر آند کار کوں

۲۔ فارس اگن ہو ٹھنڈی کفر نگون رہوا

۳۔ کفر ریت کیا ہور اسلام ریت

اسی طرح سموم باد اور وصال باد بھی استعمال کیے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ آزادی یہ برتی ہی کہ فارسی قاعدے کے مطابق ہندی فارسی الفاظ سے ملا کر فاعلی ترکیب قائم کر دی ہی۔ مثلاً

نبی مولود آ کیا ہے دو جگ تائیں نورانی   فلک پر سب ملک کرتے ہیں تاریاں سوں پھل افشانی

پنکھاں تس سو شد جون پون بیز تھے   پراں تے جو جبریل کے تیز تھے

ایک جگہ ہندی ترکیب کی رو سے روز عید کو روز ید لکھا ہی جس طرح آج کل بقر عید کو بقر ید یا بجر ید بولتے اور بعض اوقات لکھ بھی دیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کمال کیا ہی کہ ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت کا استعمال کیا گیا ہی۔ ایک جگہ لکھا ہی ؎

پیا آئے ہیں روپ کے رنگ سوں   کہ چوتا ہی اُس مکھ تھے نیر زلال

(نیر کے معنی پانی)

اس کے علاوہ فارسی واؤ عطف کا ہندی الفاظ اور جملوں میں بلا تکلف استعمال ہوا ہی۔ مثلاً

باغ و پھل و جل سہے تو اما   بن صحبت یار خوش ندیسے

تو اپے بوجے میرے سب پن و پاپ

تجھے حسن جھلکار ہے سور جلیا   زبردست توں ہی وسب تیرا زیرا

تشبیہات و استعارات عموماً سب کے سب فارسی ہیں۔ البتہ دو ایک جگہ ندرت دکھائی ہی اور مشاہدہ سے کام لیا ہی اور یہ تشبیہیں خالص ہندی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ران کی صفائی کو کیلے کے تنے سے تشبیہ دی ہی۔

کیلے گابے تھے نازک ہور صاف ران   نہیں اس کی صافی میں کوئی صاف جان

یا کنول کے پتے پر ڈھلتی ہوئی بوند کی تشبیہ

کنول کے پان پر ڈھلتی سو جل بند   کہ یا جھلتی ہو نرنیاں پوں کے

ایک جگہ ہندی مذہبی روایت سے تلمیح کی ہے ۵

نبی صدقے قطب سوں آملی ہے　　　ستا جوں رام سوں منج اوگاری

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے عربی الفاظ کو اپنے کلام میں اُسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح اُس کے زمانے میں لوگ عام طور پر بولتے تھے۔ یعنی لکھنے میں صوت کی نقل کی ہے۔ تحریر درحقیقت تقریر کی نقل ہے۔ اور اصل عربی املا کی پرواہ نہیں کی اور اُسی کو صحیح سمجھا ہے جو بولنے میں عام طور پر مُروج تھا۔ سید انشاء اللہ خاں نے دو صدی بعد اس نکتہ پر نظر ڈالی جس سے اُن کے ذوقِ زبان اور دقیق نظری کا پتہ لگتا ہے۔ وہ اپنی مشہور اور بے مثل کتاب دریائے لطافت میں لکھتے ہیں کہ "ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہو گیا ہے، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سُریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اُس کی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے۔ کیونکہ جو کچھ خلاف اُردو ہے غلط ہے۔ گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافقِ اُردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔" اس اُصول کے قائم کرنے کے بعد وہ بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صحیح بتاتے ہیں۔ مثلاً سید انشاء کی رائے میں بُرقا صحیح اُردو کا لفظ ہے گو وہ خلافِ اصل ہے۔ یا وہ غَدر کو بفتحِ دٓ اُردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ اصل میں بسکونِ دٓ ہے۔ اِس قسم کے الفاظ کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ اگرچہ یہ نکتہ اُصولِ لسان کے لحاظ سے بہت خوب بیان کیا ہے لیکن اپنے کلام میں کہیں اس پر عمل نہیں کیا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس نکتہ کو دو صدی قبل سید انشا سے بہتر سمجھا اور اپنے کلام میں جا بجا استعمال کر کے دکھایا ہے۔ مثلاً

نقل	کو	کلف	لکھا ہے	تشبیہ	کو	تشبی	لکھا ہے
صراحی	″	صرئی	″	شمع	″	شما (شمے)	″
منع	″	منا	″	وضع	″	وضا	″
ساعت	″	سائت	″	نفع	″	نفا	″
فہم	″	فام	″	انعام	″	انام	″

---

۵ ملاحظہ ہو دریائے لطافت (مطبوعہ انجمن ترقی اُردو) صفحہ ۲۴۱ و ۲۴۲ و مقدمۂ کتاب صفحہ ۵۵

مصلحت کو مصلت لکھا ہی ۔ دعوے کو داوے لکھا ہی

وداع کو ودا لکھا ہی وغیرہ وغیرہ

اِسی طرح عَرَش، فَرَش، ظُلَم، وَخَت (وقت) عِشَق، شَرَق، غُرَب، بے تکلف استعمال کئے ہیں اور اصل الفاظ کے اعراب کی پرواہ نہیں کی ہی۔

الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی بہت کم لحاظ کیا ہی۔ مثلاً

جیت، بنیاد، جوت، یاد، شبرات، بھوک، پیاس، صورت، مصلت (مصلحت)، صحبت، تعریف، روح حمد، دعا، نظر، مشکل کو مذکر باندھا ہی۔ ایک جگہ محبت کو بھی مذکر لکھ دیا ہی۔

بعض جگہ جہاں فاعل مؤنث جمع ہی تو وہاں فعل کے پہلے جزو کو بھی جمع ہی لکھا ہی۔ اُردو میں پہلے یہی استعمال تھا۔ اور اب بھی دلی اور نواحِ دلی میں بعض اوقات عورتیں اسی طرح بول جاتی ہیں۔ مثلاً

قطب شہ کوں کھلاتیاں ہیں سہیلیاں رنگ بھرا میوا

سکیاں کی دھات ایسی ہی کہ چھند سوں ۔ پیا سوں مل کہ ہوتیاں ہیں کنارے

اسی طرح کیاں ہیں، دیتیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

قافیہ میں یاے مجہول و معروف کا لحاظ نہیں کیا۔ مثلاً تیرا اور ہیرا یا دید اور بھید کا قافیہ باندھ دیا ہی۔

تمام بحریں (سوائے ایک آدھ کے) فارسی ہیں۔ عروض کا قومی زبان اور خیالات سے خاص لگاؤ ہوتا ہی۔ اُردو نے ابتدا سے، یعنی جب سے اُسے ادبی حیثیت ملی ہی، غیر زبان کا عروض اختیار کیا۔ اگر بجائے فارسی (عربی) عروض کے ہندی عروض ہوتا تو اُردو ہندی نظم اور زبان میں وہ مغائرت جو اس وقت نظر آتی ہی، نہ رہتی یا بہت کچھ کم ہو جاتی۔ یہ مسئلہ تفصیلی بحث کا محتاج ہی اور یہ موقع اس کا نہیں ہی۔ غرض سُلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہی اور خصوصاً اُردو زبان کی تحقیق کے لئے بے بہا ذخیرہ ہی۔ ہمارا ارادہ ہی کہ حواشی و فرہنگ کے ساتھ اسے شائع کریں تاکہ محققین و شائقینِ اُردو زبان کو اس سے مدد ملے۔

تبصرہ

تذکرۂ شعرا مؤلفہ میر حسن دہلوی

(از جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر الصدور دولت آصفیہ حیدر آباد دکن)

"بدرِ منیر" نے میر حسن دہلوی کے نام کو آسمانِ شہرت پر مہرِ منیر بنا کر روشن کیا۔ روشنیِ طبع نے میر صاحب کو یہ مضمون پہلے ہی سجھا دیا تھا۔ مثنوی مذکور کی نسبت کہتے ہیں ؎

رہیگا جہاں میں مرا اس سے نام کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام

"مثنوی میر حسن کو جو قبولِ عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ جو پڑھ سکتے تھے انھوں نے پڑھی۔ جو پڑھ نہیں سکتے تھے انھوں نے پڑھوا کر سنی۔ جاہلوں کا بھی یہ عالم رہا کہ جو دو چار شعر یاد تھے ان کو پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ چاندنی رات میں ماہِ کامل کی روشنی بہت سے تاروں کو نگاہ سے اوجھل کر دیتی ہے۔ یہی حال "بدرِ منیر" کی آب و تاب کے سامنے میر حسن کے باقی کلام کا ہوا۔ آبحیات میں آزاد نے لکھا ہے۔ دیوان اب نہیں ملتا۔ "تذکرہ" بھی طاقِ نسیاں کی نذر ہو چکا تھا۔ بالآخر وقت آیا کہ کلامِ حسن کا حُسنِ سادہ رونمائے عالم ہے۔ اہلِ ادب کو مژدہ کہ "انجمن ترقیِ اردو" کلیات اور تذکرہ دونوں کی اشاعت پر آمادہ ہے۔ اوّل تذکرے کی یاد ہوئی۔

تذکرۂ شعرا

یہ تذکرہ میر حسن نے اُس زمانہ میں لکھا ہے جب کہ دلّی کو خیرباد کہکر فیض آباد میں سکونت پزیر ہو چکے تھے۔ چنانچہ خود اپنے حال میں لکھتے ہیں "شروعِ جوانی از گردشِ روزگار... بطرف لکھنؤ

دفیض آباد رسیدم" تذکرہ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اُس میں "مثنوی رموز العارفین" ہے "گلزار ارم" نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۵ھ ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ھ۔ رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا اور آج اُس کی تالیف کو ڈیڑھ سو برس کا زمانہ گزر چکا۔ رسم قدیم کے مطابق یہ تذکرہ فارسی زبان میں بہ رعایتِ حروفِ تہجی لکھا گیا ہے۔ ہر ردیف میں تین دور قایم کئے ہیں۔ متقدمین۔ متوسطین۔ متاخرین۔ "دورِ متقدمین" فرخ سیر سے پہلے۔ اس دور میں زبانِ ریختہ کا رواج زبان دکن سے ہوا۔ "دورِ متوسطین" آخر عہدِ فرخ سیر سے ابتداء عہد محمد شاہ تک "متاخرین" اس کے بعد سے زمانۂ تالیف تذکرہ تک۔ اب سب متقدمین ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

یہ تذکرہ شاہد ہے کہ مؤلف کو عبارت آرائی و رنگیں بیانی میں عمدہ دستگاہ حاصل تھی۔ وہ سادہ و پرکار طرز عبارت جو میر تقی میر کے تذکرہ کی ہے اس میں نہیں۔ میر کی یہ ادبی قوت خانِ آرزو کی تربیت کا ثمرہ تھی۔ ایک مثال سن لو۔ میر تقی ایک موقع پر لکھتے ہیں "خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نگنجد" میر حسن اسی موقع پر کہتے ہیں "خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر و تقریر نہ گنجد" ارباب ذوقِ سلیم نے محسوس کیا ہوگا کہ لفظ کے اضافہ نے زورِ کلام کم کر دیا۔

اس تذکرہ کے زمانۂ تصنیف کی ایک خاص خوبی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایسے زمانہ میں تصنیف ہوا ہے کہ دورِ سوم ختم اور دورِ چہارم شروع ہو رہا تھا۔ اس طرح مؤلف نے دونوں دور کے شعراء کے چشم دید حالات قلمبند کئے ہیں۔ میر۔ سودا۔ خواجہ میر درد اور حضرت میرزا مظہر کو دیکھا اسی کے ساتھ مصحفی۔ انشا اور جرأت کو دورِ سوم اور دورِ چہارم کے طرز کلام کا ڈانڈا جہاں ملا ہے وہ اس تذکرہ کے انتخابی اشعار سے بخوبی واضح ہے۔ خوبی خاص یہ ہے کہ ایک پاکیزہ مذاق اُستاد کا قلم نکتہ سنجی کے ساتھ انصاف کی داد دے رہا ہے۔ اس لئے اہلِ کمال کے خط و خال اس آئینہ میں ہو بہو ہویدا ہیں۔

اگرچہ عبارت کا معتدبہ حصہ رنگ آمیزی کی نذر ہو جاتا ہے تاہم معصرانہ قیمتی معلومات بھی قلم سے نکلتی جاتی ہیں جس سے شاعر کے اندازِ کلام طرزِ زندگی اور صورت شکل پر معنی آفریں روشنی پڑتی جاتی ہے۔ مثلاً میر تقی کے حسب ذیل ضروری حالات زیرِ نظر آ جاتے ہیں۔ اُن کا "خانِ آرزو" کا بھتیجا اور شاگرد ہونا۔ وطن اکبر آباد۔ اس تذکرہ کی تحریر کے وقت میر تقی کا سن ساٹھ برس کا تھا اور دلی میں مقیم تھے۔ جوان محمد شاہی تھے۔ میر تقی کا

تذکرۂ متقدمین و معاصرین" یادگارِ زمانہ تھا۔ رُباعی۔ غزل۔ قصیدہ۔ ہجو۔ مدح۔ سب پر قدرت ہی۔ گرم بازاری کمالِ غزل کی وجہ سے تھی جس کی شان یہ تھی کہ "بسیار باندازو طرز ازومی تراود" میر صاحب کا صاحبِ دماغ ہونا "بسیار صاحبِ دماغ ست و دماغ اومی زیبد" عبارت آرائی میں یہ فقرہ بھی ہی" شعرش چوں دُرِ خوشاب و اندازِ سخنش بے حساب" سودا۔ حالات وصفات۔ مولد شاہجہاں آباد۔ تحریر تذکرہ کے وقت سِن کا اندازہ ستر برس کا تھا۔ نوکری پیشہ۔ سرکار نواب شجاع الدولہ میں بسلسلۂ شاعری سرفراز تھے۔ علمِ موسیقی میں مہارت تھی۔ میر حسن اکثر اُن کی خدمت میں جاتے تھے۔ اور وہ بہت کرم فرماتے تھے۔ خوش خلق۔ نیک خو۔ یار باش تھے۔ شاعری کی زندگی اُن کی ذات سے وابستہ تھی۔ طرزِ سخن "میدانِ بیان او وسیع۔ وطرزِ معانی او بدیع۔ ۔۔ درقصیدہ وہجو یدِ بیضا دارد۔ قصائد عذبِ دلاویز۔ وبیانِ ہجو بلند۔ نظمش طرب انگیز"

سوز۔ حالات وصفات۔ سید ضیاء الدین بخاری کے بیٹے۔ قطب عالم گجراتی کے خاندان سے۔ نقیہ درویش منش۔ خوشنویس۔ دانشمند۔ فطرت نہایت بلند۔ علوم تیر اندازی میں ایک رسالہ زور دار لکھا تھا۔ رنگِ زمانہ سے بددل ہوکر گوشہ نشیں تھے۔ اشعار اس خوبی سے پڑھتے تھے کہ بیان میں نہیں آسکتے طرزِ سخن "درعہدِ خود از جملہ ادا بنداں ممتاز۔ طرزِ ادائیہ ملک اوست"

جرأت۔ حالات وصفات۔ وطن اصلی شاہجہاں آباد۔ مقامِ نشو ونما فیض آباد۔ میاں حسرت کے شاگرد جوانِ چیچک رُو۔ خوش خلق۔ نیک "دریں نوجوانی بسیار بحلم وحیا بسر می بُرد" فنِ موسیقی اور ستار نوازی میں ایک حد تک قدرت۔ طبیعت بہت دردمند اور گداز۔ شوقِ شعر حدِ جنوں تک پہنچا ہوا۔ کہ کسی وقت فکرِ سخن سے خالی نہیں۔ طرزِ سخن "کلام نمکیں۔ بیانِ شیریں۔ گلزار معانیش چوں میوۂ آرزو۔ شاخ در شاخ" اس تذکرہ کا نام مؤلف نے نہیں لکھا۔

مؤلف تذکرہ کے حالات

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں جن شہروں کو ناز و نعمت کا مخزن اور علم و کمال کا معدن بنا یا تھا اُن میں خراسان کا دارالسلطنت ہرات بھی تھا۔ یہی مَردُم خیز شہر میر حسن کے خاندان کا بھی وطن تھا۔ میر امامی وہاں سے ہندوستان میں آئے جو میر حسن کے پردادا تھے ہفت قلم تھے اور فاضلِ متبحر۔ بلحاظ علم وفضل دلی میں آکر ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ یہ لکھکر

میر حسن کہتے ہیں کہ میری شاعری آبائی ہے نہ آج کی۔ ہر چند کہ میر انیسؔ نے اپنے لئے پانچویں پشت مداحی کا دعویٰ کیا ہے ع

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

مگر میر حسن کی شہادت کی بنیاد پر چھٹی پشت تھی۔ میر نفیسؔ نے کس نفاست سے اس مسالہ کو صاف کر دیا ہے ع

شمشیر فصاحت پہ ہے یہ ساتواں صیقل

سات پشتیں ملاحظہ ہوں۔

۱ - میر امامی
۲ - خواجہ عزیز اللہ
۳ - میر ضاحک
۴ - میر حسن
۵ - میر خلیق
۶ - میر انیس
۷ - میر نفیس

آمدم بر سر مطلب۔ میر حسن کا نام غلام حسن تھا۔ اُن کے والد میر غلام حسین ضاحک نے دلّی میں نشو و نما پایا۔ آخر زمانہ میں فیض آباد میں جا کر سکونت اختیار کی۔ تحریر تذکرہ کے وقت زندہ تھے اور تیس برس سے ترکِ روزگار کر کے آزادانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ عالم و فاضل تھے۔ ناظم و ناثر۔ ہزل دوست مزاج پسند۔ غزل چالیس پچاس شعر سے کم نہ ہوتی تھی۔ فن موسیقی میں بھی دخل تھا۔ قد میانہ۔ رنگ بھورا۔ داڑھی اوسط۔ ریش بچہ مُنڈا ہوا۔ سبز عمامہ بطرز عرب باندھتے تھے۔ بڑا سا جُبہ پہنتے تھے۔ فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ قصائد فارسی کی تعریف تذکرۂ شعرائے ہند کے مؤلف نے کی ہے۔ متین کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

در پیش اگر روزِ اجل آہ نہ ہوتا قصّہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
اُس آن تھمے آنسو جس آن کہ دل ڈوبا تب جان سی ہم اُٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

رباعی در منقبت

کشّافِ حقایق و نکاتِ توحید　　آں راکبِ دوشِ احمدی شاہ شہید

خود معنیٔ آیاتِ کلامِ الٰہی ست　　تفسیرِ حسینی ست بقرآن مجید

تذکرۂ میر حسن میں یہ رباعی اُن کے نام سے درج ہے۔ حالاں کہ وہ مولانا لطف اللہ شیرازی کی مشہور رباعی ہے اور فارسی تذکروں میں اُن کے نام سے درج ہے۔

رباعی

افسوس دلا کہ غمگساراں رفتند　　سیمیں بدناں و گلعذاراں رفتند

چوں بوئے گل آمدند بر باد سوار　　در خاک چو قطرہائے باراں رفتند

میر حسن دلّی میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم پائی۔ عربی سے واقف نہ تھے۔ ابتدا سے شعر و سخن کا شوق تھا اس سلسلے میں حضرت خواجہ میر درد کی خدمت میں رہکر پختگی حاصل کی۔ میر ضیا کے شاگرد تھے۔ مگر خود لکھتے ہیں کہ مجھسے اُن کی طرز کا نباہ نہ ہوسکا۔ اس لئے میر درد۔ سودا۔ اور میر کی طرز کی پیروی کی۔ تلمذ کی بابت آبحیات میں لکھا ہے "میرزا رفیع کو بھی غزل دکھائی" میر حسن کے بیان سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ وہ اپنا تلمذ صرف میر ضیا سے ظاہر کرتے ہیں۔ البتہ یہ لکھتے ہیں کہ چوں کہ میں اُن کی طرز نباہ نہ سکا۔ اس لئے میر درد اور سودا کی طرز کی پیروی کی۔ یہاں بھی سودا کی تخصیص نہیں۔ آزاد نے جو خط میر حسن کا قدرت اللہ خاں قاسم کے نام نقل کیا ہے اُس میں بھی یہی لکھا ہے "اصلاحِ سخن از میر ضیا گرفتہ ام" سودا کا نام نہیں۔ آغازِ شباب میں دلّی کی تباہی سے پریشان ہوکر اپنے والد کے ساتھ فیض آباد گئے۔ وہاں سے بالآخر لکھنو جاکر بود و باش اختیار کرلی۔ اس سفر میں دلّی سے چل کر اوّل چند مہینے ڈیگ میں رہے وہاں سے حضرت شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مکن پور گئے۔ اسی منزل کی کیفیت نے مثنوی گلزارِ ارم کی بہاریں دکھائیں۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں نواب سالار جنگ اور اُن کے بیٹے میرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گزر یہاں بھی تنگی سے ہوتی رہی۔ خود لکھتے ہیں "چنانچہ تاحال بہر نوع گزراں مینمایم"

حلیہ۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ رنگ بھورا۔ قد اچھا بڑا (میر نفیس تک یہ قد و قامت قایم تھا) پرانی وضع کی پگڑی سر پر (اب سرے سے پگڑی ہی ندارد ہے۔ پرانی وضع کون سمجھے گا) اپنے والد کی طرح بڑا سا جبّہ پہنتے تھے۔ یہ حلیہ "تذکرۂ شعرائے ہند" میں لکھا ہے۔ آبحیات میں اس کے خلاف یوں لکھا ہے "میانہ قد۔ خوش اندام۔ گورا رنگ۔ جملہ قوانین شرافت و آئینِ خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے اتنا تھا کہ داڑھی منڈاتے تھے۔ سر پہ بانکی ٹوپی تن میں تنزیب کا انگرکھا۔ پھنسی ہوئی آستینیں۔ کمر سے دوپٹہ بندھا" اہلِ نظر فیصلہ کریں کہ کونسا بیان قابل قبول ہے۔ "تذکرۂ شعرائے ہند" کی قدامت اور تحقیقات کے موقع کا زیادہ حاصل ہونا غالباً تذکرۂ شعرائے ہند کو زیادہ مستند قرار دے۔

میر حسن کے اخلاق کی بابت "تذکرۂ شعرائے ہند" میں لکھا ہے "وہ ظریف اور خوش خلق آدمی تھا۔ مگر بیہودہ اور کلام معیوب کبھی زبان سے نہیں نکالتا تھا۔ سوا ازیں شیریں مزاج خوش خلق اور پسندہ تعلیم یافتہ تھا۔ کسی شخص نے اُس کو بُرا نہیں لکھا۔ اور نہ کچھ الزام لگایا ہے"۔

آخر ماہ ذیحجہ میں علیل ہوئے۔ عشرۂ محرم ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا (یعنی مثنوی "سحر البیان" کے ختم ہونے کے دو سال بعد) مرزا قاسم علی خاں کے باغچہ کی پشت پر مدفون ہوئے۔ مصحفی نے تاریخ وفات کہی۔

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں — رُو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی — شاعرِ شیریں زباں۔ تاریخ یافت

چار بیٹے تھے۔ اُن میں سے تین محسن خلیق اور خلق شاعر ہوئے۔ شاید ہی اس کی نظیر تاریخ عالم میں ملے کہ شاعری ایک خاندان میں آٹھ پشت تک مسلسل رہی ہو۔ یہ طرّۂ امتیاز میر حسن کے خاندان کی دستار پر کھلا۔ کبھی علوم سات آٹھ پشت تک شاذونادر چلے ہیں۔ چہ جائیکہ شاعری جو وہبی ہے۔ پھر قدرت نے اس فراوانی سے یہ نعمت اس خاندان کو بخشی کہ میر حسن کے تین صاحبزادے شاعر ہوئے۔ اور تین پوتے میر انیس۔ مونس۔ اُنس ایک میر انیس تنہا ایک ملک کے فخر کے لئے کافی ہیں۔

میر حسن کا کلام

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ اب تک فقیر نے قریب سات آٹھ ہزار کے شعر کہے ہیں۔ ایک ترکیب بند کہا ہے اور ایک مثنوی رموز العارفین جو "قبول خاطر" و شہرتِ عام حاصل کر چکی ہے۔

آبحیات میں آزاد لکھتے ہیں "دیوان اب نہیں ملتا" اسی کے ساتھ قدرت اللہ خاں قاسم کا یہ قول دیوان کی نسبت نقل کیا ہی "انواع سخن سے لبریز ہے"۔ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں "آج یہ نوبت ہی کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو کتاب میں درج کرتا"۔ مثنوی گلزار ارم کی نسبت لکھتے ہیں۔ میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی اب نہیں ملتی۔ تذکرہ آبحیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ "آزاد" کو مثنوی رموز العارفین کی خبر نہ تھی۔ تذکرہ شعرائے ہند میں منشی کریم الدین نے میر حسن کی تصانیف کی نسبت عجب خلط مبحث کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں حسن مذکور کی تصنیفات یہ ہیں۔ ایک دیوان اقسام سخن کا جس میں تخمیناً آٹھ ہزار شعر ہیں۔ دوسرا تذکرہ ہندی مصنفوں کا ریختہ میں لکھا ہی۔ تیسری مثنوی بدر منیر۔ اس مثنوی کی برابر کسی سے آج تک اچھی مثنوی نہیں ہوئی چوتھی سحرالبیان۔ یہ سب سے بڑی کتاب میر حسن کی ہی۔ اس میں عورتوں کی پوشاک عجیبہ کا حال بیان کیا گیا ہے اور طوایف کا بھی اُس میں ذکر ہی اور مسلمانوں کی رسمات شادی کا بھی حال اُس میں مندرج ہی"۔ ظاہر ہے کہ "سحرالبیان"۔ مثنوی بدر منیر کا نام ہے۔ چنانچہ میر حسن نے مثنوی مذکور کے خاتمہ میں لکھا ہی ع

نئی مثنوی ہے یہ سحرالبیاں

منشی صاحب جس مثنوی کو سحرالبیان کہتے ہیں وہ گلزار ارم ہی۔ لیکن وہ مثنوی بدر منیر سے بڑی نہیں "تذکرہ" ریختہ میں نہیں لکھا بلکہ فارسی میں لکھا ہی۔ رموز العارفین کا پتہ منشی کریم الدین کو بھی نہیں لگا۔ اور چوں کہ اُن کا تذکرہ ڈی ٹاسی کے تذکرہ سے ماخوذ ہے اس لئے ماننا چاہیئے کہ ڈی ٹاسی بھی اُس سے بیخبر تھا۔ تذکرہ بھی دیکھا نہیں۔ سماعی خبر لکھدی ورنہ اُس کی زبان کی بابت ایسی فاحش غلطی نہوتی۔ یہاں ایک وقت اور ہی۔ آزاد نے آبحیات میں جو خط خود میر حسن کا قدرت اللہ خاں قاسم کے نام کا نقل کیا ہی اُس میں یہ عبارت ہی "تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ"۔ اس عبارت کے معنی خلاف ظاہر یہ لینے ہونگے "در بیان شعرائے ریختہ نوشتہ" ورنہ یہ تو بعید از قیاس ہی کہ شعرائے ریختہ کے دو تذکرے میر حسن نے لکھے ہوں۔ ایک زبان ریختہ میں دوسرا فارسی میں۔ غالباً اسی خط کی عبارت سے منشی کریم الدین کو لغزش ہوئی۔

خدا کا شکر ہی کہ جو نعمت مولف آبحیات کے لئے پردۂ ظلمات میں رہی وہ مجھکو مل گئی۔ لکھنؤ سے کلیات میر حسن کا نسخہ ہاتھ آیا۔ جو ۱۲۵۶ھ کا لکھا ہوا ہی مُطلّا اور مذہب ہی اور اُس اہتمام سی لکھا گیا ہی جس اہتمام سی فارسی شعرا کے دواوین لکھے جاتے تھے

نعمت بالائے نعمت یہ ہی کہ صحیح ہی۔ قدرت اللہ خاں قاسم کا قول بھی اُس پر صادق ہی۔ انواعِ سخن سے لبریز ہی۔ چار سو صفحوں کا حجم ہے۔ تقریباً سات ہزار شعر ہیں۔ غزل کے اشعار قریباً چار ہزار ہیں۔ چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں ہیں۔ سات قصیدے ہیں۔ مخمس۔ مسدس۔ مثلث۔ رباعی بھی ہیں۔ وہ ترکیب بند بھی (واسوخت کے نام سے) موجود ہی جس کا ذکر تذکرہ میں میرحسن نے کیا ہی۔ مرثئے نہیں ہیں۔ حالاں کہ میرحسن نے مرثیوں کا لکھنا تذکرہ میں لکھا ہی۔ اس مجموعے کی دستیابی سے آزاد کا وہ تاسف آمیز شکوہ رفع ہو جاتا ہے جو ان کو اخلافِ میرحسن سے کلیات مرتب نہ کرنے کی بابت تھا۔

جوشِ عقیدت سب سے اوّل شاہ عالم بادشاہ کا ذکر لکھا ہی۔ اس ادب کے ساتھ "ذکرِ اوّل بادشاہ جمجاہ سکندر سپاہ ظل اللہ شاہ عالم بادشاہ۔ ۔ خلد اللہ ملکہ وافاض اللہ برہ واحسانہ"۔ اس ذکر کے بعد تذکرہ شروع ہوتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرچند کہ اُس عہد میں سلاطینِ مغلیہ کے ہاتھ سے سلطنت ظاہری جا چکی تھی مگر دلوں پر حکومت قایم تھی۔

ادبی نکتے جس طرح میر صاحب نے "نکات الشعرا" کو ضمناً جابجا ادبی نکتے اور فائدے بیان کرکے زینت دی ہی اسی طرح میرحسن نے اپنے تذکرہ کو آراستہ کیا ہی۔ ریختہ کی تعریف۔ "ریختہ اوّل از زبان دکن رواج یافتہ" اس لحاظ سے یہ گرانبہا جنس شاہجہانی اُردو بازار کی دُکانوں کی ملکیت نہ تھی (میرحسن اور میرتقی میر دونوں نے اپنے اپنے تذکرہ میں اس زبان کا نام یا ہندی لکھا ہی یا ریختہ۔ اُردو جہاں تک میرا خیال ہی کہیں نہیں لکھا۔ منشی کریم الدین نے اُردو کے ساتھ ہندوستانی بھی لکھا ہی) طرزِ متقدمین و متاخرین کا فرق۔ "طرزِ متقدمین بطور ایہام۔ طرزِ متاخرین بزبان حال ادائیہ"۔ میرتقی نے خاکسار کے اس شعر میں ؎

خاکسار اُس کی تو آنکھوں سے گئے مت لگیو مجھکو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

یہ اصلاح دی تھی "بر متتبع ایں فن پوشیدہ نیست کہ بجائے "بیمار کیا" "گرفتار کیا" می بایست"۔ میرحسن کہتے ہیں "در عقلِ فقیر چنیں گزرد کہ اگر چشم خود می بود گرفتار مناسب بود۔ چوں اینجا چشمِ معشوق ست بیماری صحت دارد" دیکھو کیسی باریک بات سمجھا گئے۔ راقم کا ایک شعر نقل کیا ہی ؎

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں کہنے کو ہی یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

لکھتے ہیں کہ اس شعر میں "عین" (عاشقوں کا) تقطیع سے گرتا ہی اور یہ عینِ خطا ہے۔ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا

میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں

معینؔ بداؤنی کا ایک شعر ہی ؎

خوش ہم عُریانی سے اتنے ہیں برنگ بوئے گل　　نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک سے ہم

میر حسن کہتے ہیں "خوش ہم عُریانی ناموزون ست چراکہ "میم" با "ر" را، چناں چسپیدہ است کہ "عین" چوں چشمِ غزال ازمیاں رَم کردہ۔ وایں سخت عیب ست" سجادؔ کا شعر ہی ؎

تجھے غیر سے صحبت اب آہنی　　اسی دوستی ہم سے ہی دشمنی

میر حسن کہتے ہیں "اسی دوستی" زبانِ قدیم ست یعنی برائے ہمیں" فی البدیہ۔ راجہ رام نراین موزوں تخلص۔ نواب سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ شیخ علی حزیں کے شاگرد "آشنا پرست" سیاہ دوست۔ فارسی کا ذوق تھا۔ ریختہ کا صرف ایک شعر کہا جو مشہور ہو گیا۔ اس کا واقعہ خود میر حسن کے الفاظ میں سنو۔ "شعر ریختہ کم گفتہ بلکہ نگفتہ۔ مگر وقتیکہ خبر شہید شدن سراج الدولہ در شہر افتاد ہماں وقت فی البدیہ ایں شعر میخواند و از خبرداراں خبرمی پرسید و می گریست ؎

غزالاں۔ تم تو واقف ہو۔ کہو مجنوں کے مرنے کی　　دوانہ مر گیا آخر کو۔ ویرانہ پہ کیا گزری؟

ہمیں شعر از و یادگار ماند" ذرا اس شعر کو مکرر پڑھو اور اس کے درد کا اندازہ کرو۔ اور یہ بھی غور کرو کہ ایک "آشنا پرست" ماتحت کے دل کی واردات کا سچا نقشہ ہی۔ کیا اس کے بعد مجھکو یہ کہنے کی اجازت ملے گی کہ تاریخ کے سیاہ کا۔ بلیک ہول کے داغدار سراج الدولہ! تیرے دل میں تو محبت و ہمدردی کا چراغ روشن نظر آتا ہی! اُن کے اُستاد میر ضیاؔ نے اپنے یہ شعر اُن کو سنائے تھے ؎

تربت ضیا کی دیکھی کل رات دور سے میں　　آئے نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے

جا کر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحص　　اک دل جلے ہی اُس میں حسرت کے داغ کتنے

سلام اللہ خاں تسلیمؔ ایک فارسی گو شاعر نے ترجمہ کر کے یہی مضمون اپنے نام سے مشہور کر دیا ؎

دوش رفتم بر مزارِ کشتۂ تسلیم خویش　　می نمود از دُور صد شمع و چراغِ حسرتے

چوں شدم نزدیک دیدم از تفحص ہا بسے　　یک دلے میسوخت باوے چند داغِ حسرتے

میر حسن خفا ہیں (اور خفگی بجا ہے) "تسلیم درفارسی ترجمہ کردہ بنام خود شہرت داد۔ ایں نہ دانست کہ در نظرِ صورت شناسانِ معانی متبنیٰ و فرزند پوشیدہ نمی ماند۔ مثل ہندی مشہورست" ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں۔ جس کا ہاتھی اُس کا ناؤں" پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تسلیم کے شعر زبانِ فارسی کی قوت وصفائی کی بدولت ضیا کے اشعار سے زیادہ تابدار ہیں خصوصاً اس صورت میں کہ ضیا کی زبان بوجہ قدامت ماند پڑ چکی ہے۔ مصرع اوّل میں "کشتۂ تسلیم" نے جان ڈالدی ہے۔

میر حسن صرف ادبِ اُردو کے نقّاد نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعرا کے کلام کی نقّادی پر بھی پوری قوت تھی۔ اور ہر ایک کے طرز کا جُدا جُدا اندازہ حاصل تھا۔ چنانچہ اساتذۂ اُردو کے کلام کی طرز کو اساتذۂ فارسی کی طرز سے تشبیہ دیتے جاتے ہیں۔ میر ضیا "طرزش مانا بہ طرزِ مولانا نسبتی"۔ میر تقی "طرزش مانا بطرزِ شفائی"۔ خواجہ میر درد۔ "دیوانش اگرچہ مختصرست لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب"۔ میر درد کا ایک شعر سُن لو۔ حافظ کے بہت سے شعر یاد آجائیں گے ؏

ساقیا یاں لگ رہا ہی چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

قایم چاندپوری "طرزش بہ طرزِ طالب آملی می ماند"۔ زبان کی ٹکسال دلّی ہی۔ قایم مذکور کے حال میں "متوطن چاندپور رندینہ۔ چوں از ابتدائے جوانی در شاہجہاں آباد آمدہ بسر بُرد بنا برآں محاورۂ او درست گشت" معین بداؤنی کا ایک مصرع ہی۔ ؏

نہ آیا یار، دوپہری بھی اب ڈھلی افسوس

میر صاحب لکھتے ہیں " ایں محاورہ دُرست نیست۔ مردم شاہجہاں آباد دوپہر ڈھلی میگویند۔ دوپہری مگر مردم بیرونجات"۔ ایک شعر میں شاعر موصوف نے "بُتِ خانگی" باندھا ہی۔ میر حسن کہتے ہیں "بُتِ خانگی نامانوس ست۔ فقیر در ہیچ جا نشنیدہ"۔

<u>سرمایۂ مشترک</u> | یہ زمانہ صنعت و حرفت کی ترقی کا ہی۔ گوناگوں مصنوعات سے نہ صرف بازار بلکہ گھروں کے در و دیوار معمور ہیں۔ اسی سلسلے میں بہت سے مصنوعی مسائل کا انبار ہے جو ہماری زندگی پر مؤثر ہیں۔

انھیں مسائلوں میں سے ایک مسائلہ ملکی زبان کا ہے۔ ایک زبان صرف مسلمانوں کی ہے اُس کا نام اُردو ہے۔ دوسری ہندوؤں کی ہے اُس کو ہندی کہتے ہیں۔ ہندوستان کے چاروں گوشوں کو دیکھا۔ شہر۔ دہات۔ پہاڑ اور جنگل دیکھے مگر زبان کی یہ تقسیم کہیں عمل پذیر نہ تھی۔ تذکرۂ میر تقی میر اور تذکرۂ میر حسن کے مطالعہ سے صاف واضح ہے کہ ریختہ کہو اُردو کہو ہندی کہو جو نام چاہو رکھو مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی عام رائج زبان ہندو اور مسلمان اہلِ ادب کی محنتِ مشترکہ کا ثمرہ ہے۔ ابتدائے شاعری سے لے کر انتہا تک یہ اشتراکِ محنت عیاں ہے نکات الشعرا میں جہاں متقدمین شعرا میں خانِ آرزو اور قزلباش خان اُمید ہیں وہاں رائے انندرام مخلص اور ٹیک چند بہار بھی ہیں۔ متوسطین میں بندرابن راقم ہیں۔ میر حسن کے تذکرہ میں بھی بہت سے ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ جن میں سے بعض جگت اُستاد تھے۔ مثلاً رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص۔ اُن کی نسبت لکھا ہے "شاعر زبردست فارسی ست۔ شعر بسیار گفتہ است۔ اُستادِ ریختہ گویانِ لکھنؤ چنانچہ میاں حسرت و میر حیدر علی حیران و اکثر دیگراں شاگردِ اویند۔ در آنجا مشہور و معروف ست" حسرتِ مذکور استاذ لکھنؤ میں سے ہیں۔ جرأت کے اُستاد۔ شاگردوں کی یہ کثرت تھی کہ پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایک اور معتبر شہادت۔ منشی کریم الدین نے تذکرۂ شعرائے ہند میں (جو ڈی ٹائسی کے تذکرہ سے ماخوذ ہے) طبقۂ دوم۔ اُن شعرا کے ذکر میں لکھا ہے جو مصلح اُردو اور مُروج اس زبان کے تھے۔ اور اُنھوں نے الفاظِ کریہ کا استعمال یک قلم زبانِ ریختہ سے موقوف کر دیا۔ اس طبقے میں سب سے اوّل راجہ جسونت سنگھ متخلص بہ پروآنہ کا ذکر ہے۔ یہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے نائب راجہ بینی بہادر کے بیٹے اور رائے سرب سنگھ دیوآنہ کے شاگرد تھے۔ جرأت کی وفات کی تاریخ کیا خوب کہی ہے۔

"کہو جنت نصیب جرأت ہے"
۱۲۲۴ھ

پروآنہ کے دیوان کی بابتہ یہ رائے ظاہر کی ہے۔ "دیوان اس شاعر کا دیکھنے میں آیا۔ بہت اچھا۔ پاکیزہ شعر اُس کے ہیں۔" اسپرنگر بہادر کے پاس وہ دیوان موجود تھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں حسبِ ذیل ہندو شعرا کا ذکر لکھا ہے۔ رائے پریم ناتھ۔ ٹیک چند بہار۔ سنتوکھ رائے بیتوا۔ رسیا ناتھ سنگھ۔ لالہ سرب سنگھ دیوانہ گھاسی رام خوشدل۔ بندرابن راقم۔ لالہ بلاس رائے رنگین۔ لالہ خوشوقت رائے شاداب۔ رائے بھگاری داس عزیز۔ فارغ۔ بدھ سنگھ قلندر۔ لالہ کاشی ناتھ۔ انند رام مخلص۔ راجہ رام نراین موزوں۔ عجائب رام منشی۔

لالہ نول رائے وفا۔ اِن حالات کے ہوتے ہوئے مذکورہ بالا مصنوعی تفریق کو دیکھ کر چارہ کار یہی ہے کہ ملک اور اہلِ ملک کے حال پر افسوس کیا جائے۔

اس عہد کی معاشرت عموماً شعرا کی نسبت یہ خیال ہے کہ وہ ایک بیکار فرقہ ہے جو خیالی دنیا کی سیر میں مصروف ہے۔ کلام کی شوخی و رندی سے قیاس کیا جاتا ہے کہ قائل اپنی حالت کا مرقع کھینچ رہا ہے۔ واقعات اس خیال کا ساتھ نہیں دیتے طبقہ شعرا میں کثیر حصہ ایسے کاروباری آدمیوں کا تھا جن کا معیارِ اخلاق بلند تھا۔ اور جو شعر گوئی کو زندہ دلی کا سامان اور ادب کی خدمت تصور کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اور کمالات انسانی میں قدرت و کمال پیدا کرتے تھے۔ ذیل کے شعرا کے اخلاق و مشاغل پر نظر ڈالیے۔ اُمید ہے کہ آپ بھی میرے ہمنوا ہونگے۔ میر اثر۔ "خوش اوقات و نیک سیرت درویشے ست مُوقر۔ و صاحب سخنے ست موثر۔ عالم فاضل"۔ عاصی۔ "در علمِ تاریخ و شمشیر شناسی و لطیفہ گوئی دستے بہم رسانده"۔ رائے پریم ناتھ۔ "خطاط بے نظیر کمان دار دل پذیر۔ غزل فارسی خوب می گوید"۔ آگاہ۔ "بوسیلۂ قصّہ خوانی بسر می برد۔ دریں فن شاگردِ میر احمد مرحوم ست کہ بقصہ خوانی مشہور بود"۔ میر اعلیٰ علی۔ "خلیق و متواضع"۔ میر شیر علی افسوس۔ "داروغۂ توپ خانۂ عالیجاہ جوانے ست ظاہر و باطن آراستہ۔ بحلم و حیا پیراستہ"۔ بیدار۔ "بزیورِ حلم و حیا آراستہ"۔ حشمت۔ "سپاہی پیشہ . . . فہمیدہ و سنجیدہ۔ متواضع و مؤدب"۔ رنگین۔ "سپاہی پیشہ۔ خوش اوقات و نیک ذات۔ جوانِ محمد شاہی خطِ نستعلیق خوب می نویسد"۔ مہربان خاں رند (اس عہد کے اُمرا کا ایک نمونہ) نواب غالب جنگ بہادر والیِ فرخ آباد کے وزیر۔ "مجلسے رنگین و بزمے اِرم تزئین داشت"۔ ہر صادر و وارد کی فراخ حوصلگی سے خدمت کرتے تھے اہلِ سخن اور ہر فن کے اہلِ کمال ست ربط تھا۔ موسیقی اور ہندی شاعری میں جو کبتوں سے عبارت ہے مشاق تھے۔ مرتبۂ امارت اتنا بلند تھا کہ خود اُمرا ان کی صحبت میں تھے۔ میر سوز اور سودا کے شاگرد تھے۔ موسیقی میں بہت سے راگ تصنیف کیئے تھے۔ فن تیر اندازی میں بھی میر سوز کے شاگرد تھے۔ اور اس فن میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ شمشیر شناسی۔ ادب شناسی اور مردم شناسی بھی میر موصوف کی صحبت میں حاصل کی تھی۔ دیکھو ادب شناسی اور انسان کی قدر دانی بھی اُس زمانہ میں فن تھے جو اُستادوں سے حاصل کیئے جاتے تھے۔ اِس بیان سے خود میر سوز کے کمالات کی نیرنگی معلوم ہوتی ہے۔ میر مظہر علی۔ "پاکیزہ سرشت و نیک شعار۔ جوانے ست بعلم و عمل آراستہ و بصلاح

وتقویٰ پیراستہ" سجّاد "موصوف باوصافِ حمیدہ۔ مخلوق باخلاقِ سنجیدہ۔ . . . در لطیفہ گویاں . . . . طاق۔ در ہر امور کہ دخل کردہ بکمال رسانیدہ۔ علم طب ہم حاصل نمودہ . . . . . طلسمات۔ وانشا وخوش نویسی وشعر فہمی بمرتبۂ اعلیٰ رسانیدہ" شوق "مردِ سپاہی پیشہ۔ صاحبِ دیوان۔ از شاگردانِ سراج الدین علی خاں آرزو۔ مدّتے در سرکارِ نواب عماد الملک غازی الدین خاں بوسیلۂ سپہ گری بسر بردہ" شاعر "جوانے ست بکمال صلاحیت آراستہ و بہ علم وعمل پیراستہ۔ اہلِ دل۔ منصف۔ متواضع مؤدب۔ بزرگ وبزرگ زادہ" نواب عماد الملک غازی الدین خاں (ایک اور امیر) "بر جمیع علوم قادر و در فنونِ سخن ماہر از وزرائے ہندوستان . . . . . بود۔ . . . . . ہفت قلم وہفت زبان" فغاں "خانِ ظریف طبع۔ وخوش اختلاط۔ باہر کس خوش طبعی داشت . . . . لطائف وظرائف او مشہور ست" گریاں "جوانے ست شائستہ . . . . . سپاہی پیشہ" وحشت "سید زادۂ خوش اوقات ونیک صفات۔ جوانِ وضع دار و در فنِ سپہ گری استوار" لالہ نول رائے وفا" از تذکرہ محمد قائم چناں ظاہر ست کہ جوانے ست نوخاستہ۔ بزیورِ علم وعمل آراستہ . . . . صاحبِ حلم وحیا۔ لطافتِ مزاج از گل زیادہ . . . . . برادرِ خوردش راجہ گلاب رائے دیوان مدار المہام امیر الدولہ نواب نجیب خاں مرحوم بود۔ لیکن ایں عزیز مصروف اکتساب وغریقِ مطالعۂ کتاب۔ طلبِ ہر کمال دامن گیر حال۔ طبع دردمند داشت"

یہ نہ خیال کرنا کہ میر حسن صاحب کے یہاں حسنِ بیان وحسن ظن کا دفتر کھلا ہوا ہے اور ہر شخص سندِ تعریف سے سرفراز ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہی لکھا ہے جو خود دیکھا یا دوستانِ حقیقت داں سے سنا۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھ دیا ہے۔ "پس از دریافتِ حالِ خیر مآلِ صاحبِ سخن شمہ کہ از دوستانِ حقیقت داں مسموع نمودہ در ذیلِ اشعارِ ہر یک نوشتہ" ایسے شعرا بھی ہیں جن کی اخلاقی حالت معلوم نہ ہوئی اُن کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ مثلاً مصحفی۔ اُن کے کلام کی فصاحت اور بلاغت کی تعریف کی ہے۔ مگر اخلاقی حالت چونکہ معلوم نہ تھی اس لیئے صرف اس قدر لکھا ہے " از تخلص معلوم می شود کہ مردِ صالح ست"

مذکورہ بالا اقتباس اہلِ انصاف کو اِس امر کا معترف کرنے میں کامیاب ہوگا کہ شعرائے ماضی نکوہیدہ حال نہ تھے۔ بلکہ علم واخلاق سے آراستہ انسان تھے۔ کیا اِس سوال کا موقع ہے کہ آج کل کے مدعیانِ کمال کہاں تک علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں؟

بزرگانِ دین کی توجہ ادبِ اردو پر

عام خیال یہ ہے کہ بزرگانِ دین و علما نے اُردو ادب کی جانب توجہ نہیں فرمائی۔ اس خیال کو واقعات سے مطابق کیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب نے شروع سے حضراتِ اولیائے کرام کی آغوشِ شفقت میں تربیت پائی ہے۔ ریختہ کے اُستادِ اوّل (بقولِ میر حسن) وَلی دکنی ہیں۔ میر تقی میر اور میر حسن دونوں کی شہادت ہے کہ دِلّی میں آکر حضرت شاہ گلشن قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر رہے۔ اور فیض حاصل کیا۔ ریختہ میں فارسی کے مضامین رنگین استعمال کرنے کا مشورہ حضرت ہی نے دیا۔ میر حسن کی اصل عبارت: "وَلی . . . . . از خاکِ گجرات . . . . . در وقتِ عالمگیر بہ ہندوستان جنت نشان آمدہ در خدمتِ شاہ گلشن قدس اللہ سرہٗ استفادہ حاصل نمودہ۔ از توجہ آں بزرگوار مقبولِ اعلیٰ و ادنیٰ گردید۔"

اُردو شاعری کے تیسرے دَور کے ارکانِ چہارگانہ میں سے دو رُکن وہ عالی مرتبہ بزرگ ہیں جن کی تعلیم سے ہزاروں انسان زندگی کے مقصد سے واقف اور شاہدِ مقصود کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ یعنی حضرت خواجہ میر دَرد اور حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں قدس سرہما۔ یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ یہ شوق حضرات نقشبندی سلسلے میں اِس طرح اُردو ادب کا نقشِ اوّل و ثالث حضرات نقشبندیہ کی توجہ کا منت پذیر ہے۔ آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں: "اپنے اُستادوں اور بزرگوں سے یہی سُنا کہ مرزا جانِ جاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے جنھوں نے زبانِ اُردو کو خراد اُتارا ہے۔" آخر الذکر دو حضرات نے گوناگوں اسلوبوں سے ادبِ اُردو کو ترقی بخشی۔ خود اُستادانہ کلام کہا۔ اپنے فیضِ اثر سے اُس کو مقبول بنایا۔ شاگردوں کی تربیت کی۔ حضرت خواجہ میر درد کو دیکھو۔ خود قادر الکلام اُستاد ہیں۔ چھوٹے بھائی اثر ہیں۔ صاحبزادہ اَلم۔ قائم چاندپوری اور بھکاری داس عزیز زمرۂ تلامذہ میں ہیں۔ میر حسن نے حضرت ہی کی خدمت میں ذوقِ سخن کی پختگی حاصل کی۔ حضرت میرزا صاحب خود اُستادِ فن یقین و حزیں زمرۂ تلامذہ میں۔ اِن حضرات کے علاوہ الٰہ آباد کے دائرے بھی اس ذوق سے پُر صدا تھے۔ حضرت شاہ اجمل سجادہ نشین حضرت شاہ خوب اللہ اور اُن کے برادر بزرگوار شاہ غلام قطب الدین مُصیبت بھی شاعرانِ اُردو میں شامل ہیں۔

ایک لطیف بحث

میر تقی میر نے اپنے کلام کا انتخاب نکات الشعرا میں درج کیا ہے۔ میر صاحب کا کلام اُس پر اُن کا انتخاب۔ سونے میں سُہاگہ۔ مگر آفریں میر حسن کے انتخاب کو کہ میر کے کلام کا انتخاب خود میر سے بہتر کیا۔

مشتے نمونہ از خروارے۔ اشعارِ ذیل میر حسن کے انتخاب میں ہیں۔ میر صاحب کے انتخاب میں نہیں ؎

کہا میں نے کتنا ہی گل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے
ہی خیر۔ میر صاحب۔ کچھ تم نے خواب دیکھا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا
کیا جُدائی کو مُنھ دکھاؤنگا

اِن اشعار کی بابت یہ کہا جاتا ہی کہ چونکہ ان اشعار کے ہم طرح اشعار میر کے تذکرہ میں نہیں ہیں اس لیئے ممکن ہی کہ ترتیب تذکرہ کے بعد کہے ہوں اِس لیئے انتخاب میں نہ آئے ہوں۔ معرکہ یہ ہی کہ جن غزلوں کے اشعار منتخب کر کے خود میر صاحب نے لکھے ہیں اُن ہی غزلوں سے بعض ایسے نادر اشعار میر حسن نے انتخاب کر لیئے ہیں جو خود میر کے انتخاب سی زیادہ نادر ہیں۔ اور یہ ایک انسانی کمزوری کا پہلو ہی کہ بعض اوقات خود اپنے کمال پر وہ قلم پھیر دیتا ہی۔ تذکروں میں لکھا ہی کہ زلالی خوانساری کی معرکۃ الآرا مثنوی محمود و ایاز کا مسودہ دیکھا گیا تو اُس میں بعض ایسے نادر اشعار زلالی نے کاٹ دیئے تھے جو فارسی ادب کے لیئے مایۂ ناز ہیں۔ مثلاً۔ شبِ تاریک کی تشبیہ میں یہ بے نظیر شعر ؎

ستارہ می نمودے در میانہ
چو چشمِ گربہ در تاریک خانہ

ایسے متعدد اشعار اہلِ نظر احباب نے مثنویِ مذکور میں بعد کو اضافہ کر دیے ہیں۔

خلاصۂ کلام۔ نمونۂ کلام مذکور ملاحظہ ہو۔ ایک غزل ہی۔ دیدار دیکھنا۔ گلزار دیکھنا۔ اس غزل کے یہ اشعار میر نے انتخاب کیئے ہیں ؎

آنکھوں میں جی مرا ہی ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

ہونا نہ چار چشم دل اُس ظلم پیشہ سے
ہشیار۔ زینہار خبردار دیکھنا

میر حسن اِسی غزل کے یہ شعر انتخاب کرتے ہیں ؎

صیاد دل ہی داغِ جُدائی سے رشکِ باغ
تجھ کو بھی ہو نصیب۔ یہ گلزار دیکھنا

دوسری طرح۔ روتا رہیگا۔ سوتا رہیگا۔ اِس غزل کے یہ شعر انتخاب میر میں ہیں ؎

جو اس شور سے میر روتا رہیگا | تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا
تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے | ہمیں کچھ کہیگا تو ہوتا رہیگا

میر حسن کے انتخاب میں یہ شعر ہی ؎

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے | جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

ایک تیسری طرح ہی ۔ یار افسوس ۔ ہزار افسوس ۔ انتخاب میر ؎

مر گیا میں ملا نہ یار افسوس | آہ افسوس صد ہزار افسوس
یوں گنواتا ہی دل کوئی ۔ مجھ کو | گہے آتا ہے بار بار افسوس

انتخاب میر حسن ؎

رخصتِ سیرِ باغ ہمیں نہ ہوئی | یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

ایک چوتھی طرح ۔ وفائے بلبل ۔ جائے بلبل ۔ انتخاب میر ؎

گل کی جفا بھی دیکھی ۔ دیکھی وفائے بلبل | یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

انتخاب میر حسن ؎

کی سیر جذبِ الفت گلچیں نے کل چمن میں | توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

یہ شعر ایک دیوان پر بھاری ہی ۔ میر صاحب کا اس کو منتخب نہ کرنا سراپا حیرت ہی ۔

میر حسن کے اِس حسنِ انتخاب نے یقین ہی کہ طبائع کو اُن کے انتخاب کا مشتاق کر دیا ہوگا اِس لیئے دل چاہتا ہی کہ اور انتخاب بھی ناظرینِ مقدمہ کی ضیافتِ طبع کے لیئے یہاں لکھ دوں ۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں زندہ و مُردہ دونو کو غایتِ شفقت کے ساتھ دعائے خیر سے یاد کیا ہی ۔ اور دیباچہ میں غرض تالیفِ تذکرہ بھی یہی لکھی ہی کہ اس کو پڑھ کر شاید کوئی مجھ کو دعائے خیر سے یاد کرے ۔ لہذا خاتمۂ مقدمہ پر دعا کرتا ہوں ۔ ناظرین آمین کہیں ۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَتَجَاوَزْ عَنْ سَیِّاٰتِہٖ

انتخابِ اشعار

شاعر	مصرعِ اول	مصرعِ ثانی
آبرو	دُور خاموش بیٹھ رہتا ہوں	اِس طرح حالِ دل کا کہتا ہوں
	دِل کب آوارگی کو بھولا ہے	خاک گر ہو گیا بگولا ہے
	شوق سے جس گھر میں ہو تو جلوہ گر	آئینے ہو جائیں دیواروں میں دل
اثر	بس رفع اب خیالِ مے و جام ہو گیا	ساقی۔ بیک نگاہ مرا کام ہو گیا
	دردِ دل چھوڑ جائیے سو کہاں	اپنے باہر تو یاں گزر ہی نہیں
	کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے	اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں
	اثر کیجئے کیا کدھر جائیے	مگر آپ ہی سے گزر جائیے
	بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر	مجکو میری وفا ہی راس نہیں
	یوں خدا کی خدائی برحق ہے	پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں
	عاشقی اور عشق کی باتیں	سب جہاں سے اثر کے ساتھ گئیں
اسد	جیوں تیوں اسد کو لائے تھے اُس کی گلی تک ہم	خانہ خراب۔ راہ میں پر۔ پھر مچل گیا
آزاد	پوچھتے کیا ہو کہ بیداد کروں یا نہ کروں	یہ تو فرماؤ کہ فریاد کروں یا نہ کروں
	وعدۂ وصل تو کرتے ہو مگر سچ کہیو	دل کو اِس وعدہ سے میں شاد کروں یا نہ کروں
عاصی	مثالِ آئینہ ہم نے بھی نقشِ جہاں دیکھا	جہاں دیکھا ہر صورت تجھے قالب میں جاں دیکھا
	قیامت کی عقوبت ساری ہجرِ یار میں گزری	وہاں تھا دیکھنا جو کچھ سو سب ہم نے یہاں دیکھا
انشا	ہوئے ہیں خاکِ سرِ راہ اُس کے ہم انشا	بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے
افسوس	اُس کے اٹھتے ہی جی پہ آن بنی	دیکھیے آگے آگے کیا ہوگا
بیان	اب ہجر میں کہتا ہے کہ تھا وصل میں آرام	نالاں ہی بیاں میں نے تو دیکھا تجھے جب بھی

پیو شراب جوانو کہ موسمِ گل ہی — ہمیں بھی یاد وہ عہدِ شباب آتا ہی

جاتا ہی یار کچھ تو بیاں منہ سی بول لے — اے بے نصیب مانعِ گفتار کون ہی

ہو ویگا ذوق حسرتِ دیدار میں خلل — شیریں گزر نہ کیجیو فرہاد کی طرف

رباعی

سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہی مجھے — ہر چیز میں آ جلوہ دکھاتا ہی مجھے

کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہی یارب — ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہی مجھے

رباعی

دنیا سے بیاں چلا ہوں روتے روتے — گزری شبِ عمر اپنی سوتے سوتے

ظلمات میں تھا آبِ بقا پر افسوس — روشن یہ ہوا صبح کے ہوتے ہوتے

بیتاب — دل چھین لیا میرا بنارس کے بتوں نے — اس وقت میں تو اے مرے اللہ کہاں ہی

بسمل — ان کی مسند کی کیا کروں تقریر — نقش ہے روئے خاک پر تحریر

تاباں — عجب احوال ہی تاباں کا تیرے — کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

سید محمد تقی عرف میر گھاسی، تو ہو اور باغ ہو اور زمزمہ کرنا بلبل — تری فریاد سے جیتا ہوں نہ مرنا بلبل

جرأت — آنے کی خبر ہی اس کی لیکن — آتا نہیں اعتبار دل کو

آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں — ہی عینِ ہجر ہی میں میسر وصالِ دوست

بات میں کس کی سنوں آہ کہ اے مرغِ چمن — شور میں اپنے ہی نالوں کے سدا رہتا ہوں

اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں — تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ — چشمِ حسرت سے کہاں تک دمبدم دیکھا کریں

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا — دن گیا رات ہوئی رات گئی دن آیا

حاتم — حاتم ذکر کس کا تجھ بن کون ہے — کون ہوگا جو نہ ہوگا تو مرا

حزیں — ویراں ہوا ہی باغ خزاں سے یہاں تلک — چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

حسن — تھی ہمیں سیر کوئی دن اُسی میخانے کی — اَب خبر ہے نہ صراحی کی نہ پیمانے کی
تیغ ابرو نے تو مارا ہی تھا جو زلف نہ ہو — غیر زنجیر خبر کون لے دیوانے کی
اے حسن آپ کو سمجھیگا تو کیا بس چپ رہ — سِر حق ہے یہ نہیں بات ترے پانے کی
حیران — دلِ ستم زدہ کا آج پوچھتے ہو حال — غمِ فراق سے کب کا ہُوا بہشت نصیب
حسرت — کہے وہ اپنے منھ سے قتل حسرت کو کیا میں نے — مرے مرنے کی عالم میں خبر یوں ہو تو بہتر ہے

قطعہ

تم جو کہتے ہو کہہ دو حسرت کو — آہ و فریاد یاں کیا نہ کرے
آپ کا اس میں کیا بگڑتا ہے — دردِ دل کی کوئی دوا نہ کرے
عشق کب تک آگ سینے میں مرے بھڑکائیگا — راکھ تو میں ہو چکا کیا خاک اَب سلگائیگا
نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں — لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائیگا
قیامت مجھپہ شب اُس کا ترحم اور تظلم تھا — کبھی تھیں گالیاں منہ پر کبھی لب پر تبسم تھا
ایسی ہی آہ باتیں اُس بے وفا نے چھیڑیں — روتے ہی روتے جس میں روزِ وصال گزرا
اُس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا — جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا
چھوڑ دے کوئی کسی کے لیے جس طرح سے کچھ — ہم نے منت میں تری کون مکاں چھوڑ دیا
کرتے تو مجکو قتل کیا ہے پر اب حسن — کیا کیا نہ اپنے جی سے وہ باتیں بنائیگا
جز اشکِ بلبل اب نہیں گل شاخسار پر — کیا اوس پڑ گئی ہے چمن میں بہار پر
اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے تو کیا — ہو چکی واں بہار ہی آخر
مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں — ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں
ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی — تمام عمر لگی پر فہم یہ سر نہ ہوئی
شبِ فراق میں رو رو کے مرگئے آخر — یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی
جان دل میں اُداس سی میرے — اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

مرزا قاسم علی — [illegible]

جب قفس میں تھے تو تھی یادِ چمن ہم کو حسن   اب چمن میں ہیں تو پھر یادِ قفس آتی ہے

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے   دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی   پر ایک جان تو ہی جس بن نہیں گزرتی

کچھ ہو نہ ہو وے ہو تیرا خیال ہر دم   اس بن نہیں گزرتی اس بن نہیں گزرتی

رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا   بس اے زندگی ایسی ہستی سے گزرے

رباعی

دنیا داری میں اور نہ دینداری میں   چاہت میں کسی کی ہیں نہ بیزاری میں

حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح   سویا کرتے ہیں عینِ بیداری میں

پہنچے نہ حسن منزلِ مقصود کو ہم۔ اور   آخر ہوئے سب زیست کے ایام سفر میں

کرم اللہ خاں درد   اگر وہ بت کسی صورت سے میرا رام ہو جائے   تو پوچھو اس عقیدت سے کہ کفر اسلام ہو جائے

تری ترچھی نگاہوں نے کیا ہے نیم بسمل کر   اگر بھر کر نظر دیکھے تو میرا کام ہو جائے

تحملِ آتشِ غم میں دلِ بیتاب کیا جانے   ٹھہرنا ایک دم بھی آگ پر سیماب کیا جانے

کنارے سے کنارہ کب ملا ہی بحر کا یارو   پلک لگنے کی لذت دیدۂ پُر آب کیا جانے

حضرت خواجہ میر درد   خوابِ عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے   آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

بارے مجھے بتا تو سہی کیا سبب ہوا   پھر مجھ پہ مہربان ہوا تو غضب ہوا

کی تو تھی تاثیرِ آہِ آتشیں نے اُس کو بھی   جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

مدرسہ یا دیر یا کعبہ تھا یا بت خانہ تھا   ہم سب ہی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا   خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ   وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

جان سے ہو گئے بدن خالی   جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

نالہ فریاد آہ اور زاری   آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی / ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا / برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا / بس ہجوم یاس دل گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا / پر وہ کیا کچھ تھا کہ دل کو بھا گیا

کسی سے کیا بیاں کیجے اس اپنے حال ابتر کا / دل اس کے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو / ورنہ کچھ طاعت کی خاطر کم نہ تھے کرّوبیاں

ہم کس ہوس کی تجھ سے فلک جستجو کریں / دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک دم میں یہ کثرت نمائیاں / گر آئینہ کے سامنے ہم ایک ہو کریں

تیرے سوا نہیں کوئی دو نو جہان میں / موجود ہم جو ہیں بھی تو اپنے گمان میں

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو / کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

اپنے بندوں پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو / پر نہ آ جائے کبھی جی میں کہ آزاد کرو

اس مستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں / اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا / تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یاں مجھے / اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

نہ وہ نالوں کی شورش ہے نہ وہ آہوں کی ہے دھونی / ہوا کیا درد کو یا رب گلی کیوں آج ہے سونی

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن / میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

رباعی

کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم / تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم

جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی / ساتھ اپنے دوچار ہو گئے ہم

رباعی

اے درد یہ درد جی سے کھونا معلوم / جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم

گلزار جہاں ہزار ہووے لیکن / میرے جی کا شگفتہ ہونا معلوم

رباعی

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی — اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیان کریگا اس کو — کہتے ہیں ہم آپ اب کہانی اپنی

درخشاں - تھی دِرائے ناقۂ لیلےٰ کی ہر دم یہ صدا — آہ مجنوں پا شکستہ رہ گیا محمل سے دور

رسوا رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے — ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے
وصل میں بیخود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو — اِس دِوانے دل کو رسوا کس طرح سمجھائیے
وہ کون سی زمیں جو اسکوں سے نم نہیں — رسوا ابھی اس زمانہ میں مجنوں سے کم نہیں
دیگرے را در گرفتاری شریکِ ما مکن — مدعا گر شہرتِ حسن ست یک رسوا بس ست

رند سینے سے داغِ عشق مٹایا نہ جائیگا — ہم سے تو یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

رقم پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب — یا رب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے
سنتے ہیں ہم کہ ہوتی ہے جگ میں دوامِ صبح — ہو گی کبھی اے چرخ ہماری بھی شامِ صبح

قطعہ

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض — ہم کو قسم جو توڑیں ترے برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ہم اور عندلیب — آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھکر کہیں
کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے — اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر

رضا دنیا میں کوئی تجھ سا ستمگار نہیں ہے — بے رحم جفا پیشہ و خونخوار نہیں ہے

زار چھوٹ جاویں غم سے ہر دم کے جو نکلے دم کہیں — خاک ہے یہ زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں
ایک دن آگے ہی دنیا سے اُٹھانا ہم کو — شبِ فرقت تو الٰہی نہ دکھانا ہم کو
ہمیں تو فرش سے اور تکیۂ مخمل سے بہتر ہے — گلی میں اُس کی پڑ رہنا سرہانے ہاتھ کو دھر کے

سراج نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جانا — کہاں سراج کہاں آفتابِ عالم تاب
اس بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی — جب رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں
لوٹتا ہے تب سے انگاروں پہ دل

وہ ظالم مجکو جلتا دیکھ کر اتنا نہیں کہتا
کہ کیا ثابت قدم ہے کیوں نہ ہو آخر سراج اپنا

سعادت

واللہ جو سرِ لوح ترا نام نہ ہوتا
ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

سجاد

جان و دل سب قبول ہے جانا
پر گلی میں تری مجھے آنا

اس فصلِ گل میں جوشِ جنوں کا ہوا ہے قہر
جنگل میں آپ ہی نکل کر تمام شہر

اس زمانے میں دوستی کا رنگ
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

سودا

سودا کا تو نے حال نہ دیکھا کہ کیا ہوا
آئینہ تیرے آپ کو دیکھے ہے تو ہنوز

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

فکرِ معاش و کربتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

گر ہو شراب و خلوت و معشوقِ خوب رو
زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

عشرت سے دو جہاں کی یہ دل ہاتھ دھو سکے
تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہ ہو سکے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

منڈا کر خط تم اپنے حق میں کیوں کانٹوں کو بوتے ہو
یہ عارض گل نہ ہو وینگے عبث سبزہ بھی کھوتے ہو

صورت میں تو کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے
اک دھج ہے کہ وہ قہر ہے آفت ہے غضب ہے

پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب
ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئی پھولے پھلے گئے

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

نہ تلطف نہ مروت نہ محبت نہ وفا
سادگی دیکھ کے اس پر بھی لگا جاتا ہوں

محمد میر سوز

یار یوں دور جا بسے اللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

سوز کچھ منھ بنائے آتا ہے
آج مجرے کا پھر جواب ہوا

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

بغیر از عاشقی کچھ کام مجھسے ہو نہیں سکتا
تڑپنے کے سوا کچھ کام مجھسے ہو نہیں سکتا

مثلِ نے ہر استخواں میں درد کی آواز ہے | کچھ نہیں معلوم یارب سوز ہے یا ساز ہے

شاعر اپنے مطلب کی کہے جائینگے ہم | گرچہ سو بار نہیں کیجئے گا

ضیا کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی ای ننگِ خلق | اُس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

مجھ سا بندہ نہیں خدائی میں | ہاتھ سے اے صنم نہ کھو مجکو

آہستہ پاؤں رکھیو اے بوئے گل چمن پر | سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

اک تبسم میں کیا خلق کو ساری تسخیر | مسکرانا ہے ترا یا کہ کوئی افسوں ہے

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا | آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

کبھی جا گل کو دیکھے ہیں کبھی دیکھے ہیں نرگس کو | خدا جانے یہ چشم اپنی پھرے ہے ڈھونڈتی کس کو

ہم نہ مثمر نہ ہم نہال ہوئے | اُگتے ہی ہم تو پائمال ہوئے

دل کے جلنے پر نہ کی رقت کسی نے رحم سے | خود بخود جل بل یہ انگارا دہک کر رہ گیا

کعبہ میں چھپ رہا ہے یا دیر میں نہاں ہے | خانہ خراب جلدی تو بول اُٹھ کہاں ہے

کیا کہا قاصد ضیا سنتے ہی جس کے مرگیا | بات تھی کچھ یاس کی یا ہجر کا پیغام تھا

ظہور چشمِ گریاں حسن سے معمور ہے | چاندنی برسات کی مشہور ہے

مرزا عسکری بات اب امتحان پر آئی | قصہ کوتاہ جان پر آئی

عشق کہنے کو اِدھر اُدھر گئے ہم | تھے تیری طرف جدھر گئے ہم

تھا کعبہ و دیر سے کسے کام | مقصود تھا وہ جدھر گئے ہم

فراق اسیروں قسم تجکو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں | کوئی اُن ہمنواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے

فقیر زندگی موجِ آب ہے گویا | دم کا آنا حباب ہے گویا

فغاں دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے | گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

یہ امتحاں نہ کر اے میرے مہربان عزیز | جہان میں کوئی تجھ سے رکھیگا جان عزیز

فغاں کو وصل میں آرام کیا ہو | جدائی کا تصور بندھ رہا ہے

فدوی

فدوی مرا ہی کام ہے روز اٹھکے جسطرح — رکھتا ہوں تھام تھام دلِ بیقرار کو

فارغ

اشک آنکھوں سے جو نکلا سو وہ گوہر نکلا — بعد مدت کے مری چشم کا جوہر نکلا

افصح

کر یاد تجھے جدہر گئے ہم — ہم تو نہ رہے کدہر گئے ہم

سرمۂ چشمِ جہاں ہیں ہونا — خاکساری کی کرامت دیکھی

قائم

اِن دنوں چرخ پر نہیں یہ مہر — گود میں کانگڑی لیئے ہے سپہر

دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات — کالے کمل میں ات کاٹے رات

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی نادم ہوں — کیا کہوں پر رہا نہیں جاتا

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا — پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا

ہم نے ہر طرح ہجر میں دل شاد کیا — ہچکی آئی تو یہ سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

کوہ اور دشت میں بھی ہم نہ رہے آسودہ — ماتمِ قیس کیا یا غمِ فرہاد کیا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر — روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

خوب نکلے ہم اُس کے کوچہ سے — ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات

آہ اے پیرِ چرخ قائم نام — یاں جو رہتا تھا اک جواں ہے یاد

بے شغل نہ زندگی بسر کر — گر اشک نہیں تو آہ سر کر

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی — اِس سے جو کوئی جیا تو مر کر

وہ محو ہوں کہ مثالِ حبابِ آئینہ — جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں — یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

میں کہا۔ عہد کیا کیا تھا رات — ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

نازو ادا کہیں کہیں عجز و نیاز ہے — کس کس طرح سے یار مرا جلوہ ساز ہے

حسرتِ دل کو میری سمجھے وہی خستہ جسے — یار نے آکے دمِ بازپسیں دیکھا ہے

گو ۔ کہیں یار ۔ بلایا ہی وہ اب آتا ہے — پر اُسے میں تو سمجھتا ہوں وہ کب آتا ہی

شام ہوتی نہیں اک دل پہ بلا ہوتی ہی — صبح ہوتی نہیں اِک جی پہ غضب آتا ہی

مر جائیے کسی سے پر الفت نہ کیجیے — جی دیجیے تو دیجیے پر دل نہ دیجیے

شب گریہ سے وابستہ مری دل شکنی تھی — جو بوند تھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی

مردنِ دشوار میں یہ جانِ بے تقصیر ہے — حسرتِ دل سو طرف سے اس کے دامن گیر ہی

فلک رُلائے تو یہی ہم کو لیکن ڈر ہے — کہ بلبلا سا کہیں آپ ہی بہا نہ پھرے

مجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں — ہی یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں

قائم میں عندلیبِ خوش آہنگ تھا ولے — زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

آج اے گریہ خبر لے مرے دیوانے کی — کچھ رکا جاتا ہی دل گرد سے ویرانے کی

آج کی رات جو اُس گل کا میسر ہو وصال — شمع روشن کروں میں خاک پہ پروانے کی

قدرت

اہلِ عدم کو رمزِ فنا کا تھا کب شعور — سر مشقِ زندگاں مرا لوحِ مزار تھا

تڑپوں ہوں خاک و خوں میں پڑا جس کے وار سے — قدرت میں کیا کہوں یہ وہی شہسوار تھا

کس کی نیرنگی یہ شمع پردۂ فانوس ہے — جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہی

جوں نقشِ قدم ہیں ترے وہ خاک نشیں ہم — تا مٹ نہ چلیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم

سینہ اُس کا ہی دل اس کا ہی جگر اُس کا ہی — تیرِ بیداد جدھر رُو کرے گھر اُس کا ہی

قربان

یوں بندِ قبا کھل گئے جو آن میں گل کے — کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گل کے

کیا کچھ دلِ بلبل پہ کرے دیکھیے یہ عشق — سو چاک دیئے جس نے گریبان میں گل کے

کافر

رباعی

کیا پھرتی ہی میکدے میں مٹکی مٹکی — زاہد عابد سے دُور بھٹکی بھٹکی

قاضی کا نہ ڈر نہ محتسب کا کافر — یہ دخترِ رز بھی جس سے آ کے اٹکی

کلیم

آتی دل پہ قلقلِ مینا سے اب شکست — وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

گمان

مدت سے ہو رہا تھا مرا داغ داغ دل — اس گل کے دیکھتے ہی ہوا باغ باغ دل

فیضِ گل سے پھر ہوا اب گرم بازارِ چمن — مشتِ پر لئے کر ہوئی بلبل خریدارِ چمن

مجھے تو زیست بھی دشوار ہو گئی ہے اب — خدا کرے کہ گماں دل مرا سنبھل جائے

قتل کر مجکو مری نعش پہ بولا قاتل — ہائے یارو یہ گماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

گریاں

دیکھے تو جسے نگاہ بھر کر — مر جاوے وہیں وہ آہ بھر کر

سبک روحی یہ پروانے کی جی کو داغ کرتی ہے — کہ دوشِ شمع پر رکھتا نہیں بارِ کفن اپنا

مضمون

ہم نے کیا کیا نہ ترے ہجر میں محبوب کیا — صبرِ ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

میر مدد اللہ۔ رند۔ اشک آنکھ سے دل ہاتھ سے جی تن سے چلا جائے — اے وائے مصیبت کوئی کس کس کو سنبھالے

منعم

بھولی نہیں ہے مجکو بتوں کی ادا ہنوز — دل کے نگیں پہ نقش ہے نامِ خدا ہنوز

تصویر اُس کی کھینچ کے ناز و ادا کے ساتھ — نازاں ہے اپنے آپ پہ دستِ قضا ہنوز

محمد تقی۔ میر

کیا دن تھے وہ کہ یاں بھی دلِ آرمیدہ تھا — رو آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ تھا

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا — بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم — عمر گذری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جی گیا میر کا اس لیت و لعل میں لیکن — نہ گیا ظلم ہی تجھ سے نہ بہانا ہی گیا

کہاں آتے میسر تجکو تجھ سے خود نما اتنے — یہ حسنِ اتفاق۔ آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

صیاد دل ہے داغِ جدائی سے رشکِ باغ — تجکو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے — جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا — جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے — ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا — خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا — کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُسکے میر — سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہُوا

مانندِ شمع آتشِ غم سے پگھل گیا — بزمِ جہاں میں روتے ہی روتے میں گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر — تیوری چڑھائی تونے کہ یاں جی نکل گیا

یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رُخِ زرد پر مرے — کہتا ہے میر رنگ تو کچھ اب نکھر چلا

رخصتِ سیرِ باغ ہم کو نہ ہوئی — یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

گُل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بُلبُل — اِک مشتِ پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

کی سیر جذبِ اُلفت گلچیں نے کل چمن میں — توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہو کے مر چلے — اے اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو — مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر — کیا ربط محبّت سے اُس آرام طلب کو

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر — جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

جاتا ہے آسماں لیئے کوچہ سے یار کے — آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

آتا ہے جی میں حالِ بد اپنا بھلا کہوں — پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں

نازِ چمن وہی ہے بُلبُل سے گو خزاں ہے — ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخِ زعفراں ہے

از خویش رفتہ اکثر رہتا ہے میر اُس بن — کہتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اِس طرح کے رونے کو کہاں سے جگر آوے

کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہے — گُلِ گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

کام تھے عشق میں بہت پر میر — ہم ہیں فارغ ہوئے شتابی سے

دمِ نزع دشوار دی جان اُس نے — مگر میر کو آرزو تھی کسی کی

مر گیا کوہکن اِسی غم سے / آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

کتنا خلافِ وعدہ ہُوا ہوگا وہ کہ یاں / نومیدی اور اُمید مساوات ہوگئی

وہ کیا چیز ہی آہ جس کے لیئے / ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

دکھائی دیئے یوں کہ بیخود کیا / ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

کوئی نا اُمیدانہ کرتے نگاہ / سو تم ہم سے مُنھ بھی چھپا کر چلے

بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے / نیک بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں

اُس کے کوچہ میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر / ایسے ہنگامے تو یاں روز ہُوا کرتے ہیں

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں / یاں کبھی سرو و گل کے سائے تھے

ڈوبے اُچھلے ہی آفتاب ہنوز / کبھی دیکھا تھا تجھکو دریا پر

اِن دونوں یاروں کی نظروں سے نہاں رہتے ہو / خوش رہو میر مری جان جہاں رہتے ہو

رباعی

ہر صبح غموں میں شام کی ہی ہم نے / خونابہ کشی مدام کی ہی ہم نے

یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر / مر مر کے غرض تمام کی ہی ہم نے

مِنّت

مِنّت ایسے کو دل دیا تو نے / اے مری جان کیا کیا تو نے

مُحبّ

عارض اُس کے تھے عرق سے یوں سحر بھیگے ہوئے / جس طرح شبنم سے دو گُلبرگِ تر بھیگے ہوئے

اشک سے مژگاں ہے نم تجھ تک پہنچتی نہیں نگاہ / مانعِ پرواز ہیں طائر کے پر بھیگے ہوئے

مُمتاز

ڈروں ہیں کس لیئے رنجش ہیں پیار میں کیا تھا / میں اب خزاں کو روؤں بہار میں کیا تھا

جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس / اور اپنی خاطر اُمیدوار میں کیا تھا

ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک / وگرنہ ہستیِ ناپائدار میں کیا تھا

عشق میں عرضِ تمنا مانعِ دیدار ہے / میرا ہی دستِ دعا منھ پر مرے دیوار ہے

یاد اُس شوخ کی اِس دل میں بھری رہتی ہے / لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر میں پری رہتی ہے

محترم
محترم کیا بیاں کروں تجھ سے — اِس دلِ داغدار کی صورت

مستمند
نزع تک وصل کی ہی یار اُمید — ہی مثل ایک دم ہزار اُمید

مائل
کہتا نہ تھا کہ باز آ ہردم کی اس ہنسی سے — آخر گیا نہ ظالم اِک بے گناہ جی سے

مصحفی
جہاں کا گُل بنے وہ شوخ یارب — مجھے تو اُس چمن کا خار وخس کر

وقفہ

اے پیکِ نگہ دیدۂ تر ہے درپیش — دن ہیں برسات کے اور رہ میں خطر ہی درپیش
دلِ حیراں کی مری دیکھیے صورت کیا ہو — اب تو واں آئینہ ہی آٹھ پہر ہی درپیش
ہی نہاں داغِ جگر زخمِ نمایاں کے تلے — جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے
آشیاں بندی کی تکلیف نہ کر ہم کو ہوس — گر رہینگے کسی دیوارِ گلستاں کے تلے

مجذوب
چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر — صیّاد نے سنا یہ ترانا تو ہم رہے
عجب قسمت ہی اپنے دل کی بازارِ محبت میں — جو کوئی صبح اُس کو لے گیا تو شام لے آیا

ناجی
اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں — عارضی میری زندگانی ہے

ولی
پھر میری خبر لینے وہ صیّاد نہ آیا — شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا
صنم کے لعل پر وقتِ تکلّم — رگِ یاقوت ہی موجِ تبسّم
زندگی جامِ عیش ہی لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
عجب کچھ لطف رکھتا ہی شبِ خلوت میں گلرو سے — سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
اے جانِ ولی وعدۂ دیدار کو اپنے — ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو
ہی حسن ترا ہمیشہ یکساں — جنّت سے بہار کیونکہ جا دے
آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہی اُس کو — کرتی ہی نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

وحشت
لگتا ہی مجکوں آج یہ سارا جہاں خراب — شاید کہ مرگیا ہی کوئی خانماں خراب

وفا
حسنِ عمل پہ اپنے نہ پھول اس قدر کہ شیخ — واں کے معاملے کی کسی کو خبر نہیں

دُکھ نہ دے اس قدر وفا کیش — آخرش وہ بھی جان رکھتا ہے

بس کہ اپنے انقلابِ بخت سے ڈرتے ہیں ہم — بسترِ گل پر بھی لرزاں ہی قدم دھرتے ہیں ہم

کل کا وعدہ کر لیا ہے اُس نے اے محرم تو کیا — یاں تو بے تابی سے دل کی آج ہی مرتے ہیں ہم

نہ کشتی پار ہی بہہ کر گئی اپنی نہ وار آئی — ہوئے ہیں غرقِ دریا اس گھڑی جب عین دھار آئی

شب و روزِ وصل کو دیئے کہ عجب وہ لیل و نہار تھا — کبھی ہم سے یار کو لطف تھا کبھی ناز تھا کبھی پیار تھا

یک رنگ

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے — میرا صبر و قرار جاتا ہے

خیالِ چشم و ابرو کر کے تیرا — کوئی مسجد گیا کوئی خرابات

زخمی بہ رنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا

اندھیری جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ — ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا

یار

جائے سنگِ لوحِ تربت نصب کیجو آئینہ — تا کوئی جانے کہ یہ حسرت کشِ دیدار تھا

آفریں اے دستِ گستاخِ محبت آفریں — یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

۱۶ر نومبر ۱۹۲۱ء
حیدرآباد دکن

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

لارڈ میکالے کی یادداشت مسئلہ تعلیم پر[1]

ترجمہ

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب۔ رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

مجلس تعلیمات کی جو تحریریں اس وقت (گورنر جنرل کی) کونسل کے سامنے پیش ہیں، میں نے اُن کے تیار کرنے میں عمداً کوئی حصہ نہیں لیا۔ کیوں کہ مجلس کے بعض اراکین کی رائے یہ معلوم ہوتی ہی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹھیک اُن اُصول کے مطابق ہی جنھیں پارلیمنٹ نے ۱۸۱۳ء میں مُعین کر دیا تھا۔ اور اگر یہ صحیح ہو تو ہمیں اپنے موجودہ طرزِ تعلیم میں تبدیلی کرنے کے لئے ایک دوسرا قانون بنانا پڑے گا۔ لیکن میری یہ رائے نہیں ہی اور اسی واسطے میں نے مجلس تعلیمات کی مذکورۂ بالا کارروائی میں (بہ حیثیت صدر نشین مجلس) شرکت نہیں کی تاکہ جب یہ مسئلہ کونسل میں آئے تو میں بہ حیثیت رُکنِ کونسل آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قانونِ پارلیمنٹ کا جو مفہوم لیا جا رہا ہی اس کی تاویل کیا ہو سکتی ہے؛ قانون میں

---

[1] ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ یادداشت نہایت اہم ہی۔ ہمارے ملک کی تاریخ تعلیم یا مسئلہ تعلیم پر کوئی کتاب کوئی رسالہ یا مضمون ایسا نہیں جس میں اس تحریر کا حوالہ نہو۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جنھوں نے اصل یادداشت کو ملاحظہ کیا ہو۔ اکثر اصحاب اس کے دیکھنے کے شایق تھے اور خاص کر ہمارے دوست حافظ ساجد علی صاحب عباسی (وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن) کا شدید اصرار تھا کہ اس کا ترجمہ اُردو میں شائع ہو چونکہ اس میں ذریعۂ تعلیم اور عربی سنسکرت اور دیسی زبانوں کی بحث آپڑی ہے اور اسی پر موجودہ تعلیم کی بنیاد رکھی گئی ہے اس لیے ہم نے اس کا شائع کرنا مناسب اور ضروری خیال کیا (اڈیٹر)

کسی خاص زبان یا علم کی تعلیم دیئے جانے کے متعلق کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس میں صرف مصارف کی ایک مد اس غرض کے لئے علٰحدہ کردی گئی ہی کہ اس روپے سے "علم ادب کے احیا اور ترقی دینے کا کام لیا جائے نیز ہندوستانی اہلِ علم کی ہمت افزائی اور سرکار انگریزی کے علاقوں میں علوم کی ترویج و اشاعت کی جائے" اب حُجت یہ پیش کی جاتی ہے بلکہ اس بات کو مسلم قرار دے لیا گیا ہے کہ "علم ادب" سے پارلیمنٹ کی مُراد صرف سنسکرت اور عربی علم ادب ہوسکتی ہے اور "ہندوستانی اہل علم" کے مُعزز لقب کے وہ لوگ کسی طرح اہل نہیں ہوسکتے جنھیں ملٹن کے کلام لوکؔ (Locke) کے فلسفۂ الٰہیات اور نیوٹن کی طبعیات سے آگہی ہے بلکہ اس لفظ کے مخاطب پارلیمنٹ کی نظر میں صرف وہ حضرات ہیں جنھوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں کُشا گھاس کے تمام طریق استعمال یا پرمیشور سے مل جانے کے سارے بھید پڑھ لئے ہیں! مگر میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ اطمینان توجیہ نہیں ہی۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ پاشائے مصر کچھ روپیہ "احیائے علوم اور اہل علم کی سرپرستی" کے نام سے مخصوص کرتا ہی۔ ظاہر ہے کہ ایک زمانے میں ملکِ مصر یورپ کی قوموں سے علمی ترقی میں کہیں آگے تھا مگر اب اُن سے بالکل پیچھے رہ گیا ہی۔ تو کیا اس پاشائے مصر کی سرپرستیٔ علوم کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے علاقے کے لڑکوں کو سالہا سال تک قدیم خطِ تصویر کی تعلیم دلانی چاہتا ہے تاکہ وہ اسائرس دیوی کی کہانی میں جو نکتے پنہاں ہیں ان کا سُراغ لگائیں اور بلیوں اور پیاز کی قدیم پرستش کی ایک ایک رسم کو کمال صحت کے ساتھ تحقیقات کرتے رہیں؟ اس کے برخلاف اگر وہ اپنی رعایا کو خطِ میخی کی عبارتیں پڑھنے کے بجائے انگریزی اور فرانسیسی زبان اور وہ علوم سیکھنے کا حکم دے جو زیادہ تر انھیں زبانوں کے ذریعے حاصل ہوسکتے ہیں تو کیا کوئی انصاف پسند آدمی اس پاشا کو یہ الزام دے گا کہ وہ سرپرستی علوم کے مقصد سے انحراف کرتا ہی؟

قدیم علوم کے حامیوں کا جن الفاظ پر انحصار ہی اوّل تو اُن کا وہ مطلب نہیں جو وہ نکالنا چاہتے ہیں دوسرے فقرے کے آخری حصے سے قطعی طور پر اُن کے خلاف نتیجہ نکلتا ہی کیوں کہ پارلیمنٹ نے یہ ایک لاکھ روپیہ نہ صرف احیاءِ علوم کے واسطے دیا ہی بلکہ ایک غرض یہ بھی ہے کہ اسے "سرکار انگریزی کے علاقوں میں علوم کی ترویج و اشاعت میں" صرف کیا جائے۔ اور یہی الفاظ اُن تمام تبدیلیوں کو جائز ثابت کرنے کے لئے

کافی ہیں جن کے واسطے میں نے یہ بحث اُٹھائی ہے۔ اب اگر کونسل کو مجھسے اتفاق ہو تو کسی نئے قانون کی ضرورت پیش نہ آئے گی لیکن اگر اراکین کونسل ان معنی میں مجھسے اختلاف رکھتے ہوں تو میں ایک مختصر سا قانون مُرتب کر دوں گا کہ ۱۸۱۳ء کے فرمانِ شاہی سے اس فقرے کو حذف کر دیا جائے جس کی وجہ سے یہ دقتیں پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن یہ تو محض ایک ضابطہ کی بات ہوئی۔ ہمیں پہلے اُس دوسری دلیل پر غور کرنا چاہیئے جسے مشرقی علوم کے حامی پیش کرتے ہیں اور اگر اسے درست مان لیا جائے تو پھر موجودہ طرز تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ ان صاحبوں کے ذہن نشین ہو گیا ہے کہ موجودہ طرز تعلیم کے جاری رکھنے پر ہی سرکار کی حسنِ معاملت کا انحصار ہے اور اگر ہم مذکورۂ بالا مد کا روپیہ جو اب تک عربی و سنسکرت کی ترقی میں صرف کرتے رہے ہیں کسی دوسرے کام میں صرف کریں گے تو یہ گویا ایک قسم کی بدعہدی ہوگی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سے طریق استدلال سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں؟ سرکاری طور پر جو روپیہ علوم کی سرپرستی کے لئے دیا جاتا ہے اُس کی نوعیت اُسی قسم کے مصارف کی سی ہے جو سرکار لوگوں کے کسی حقیقی یا خیالی فائدہ کے واسطے ادا کرتی ہے۔ اب اگر ہم ایک صحت گاہ (سینی ٹوریم) ایسے مقام پر تعمیر کرا دیں جس کی آب وہوا کو ہم نے پہلے صحت بخش سمجھا تھا مگر بعد میں اس کے خلاف ثابت ہوا تو کیا ہم اس بات کے پابند ہو جائیں گے کہ وہ صحت گاہ اسی مقام پر رہے؟ یا یہ کہ اگر ہم ایک بند بنوانا شروع کریں اور کچھ عرصے بعد یہ دیکھ کر کہ اسے وہاں بنوانے سے کوئی فائدہ نہیں، ہم اُس کی تعمیر روک دیں تو کیا ہم لوگوں کے ساتھ بدعہدی کرنے کے مجرم قرار پائیں گے؟ لوگوں کے مالی حقوق کا بے شبہ پورا لحاظ رکھنا واجب ہے۔ لیکن آج کل جو ان حقوق کا سراسر بے وقت اور بے محل راگ الاپا جانے لگا ہے اس سے تو اندیشہ ہے کہ ان حقوق کو اُلٹا نقصان نہ پہنچ جائے اگر لوگوں کے نام کا روپیہ بُری جگہ صرف کیا جائے اور پھر حجت یہ پیش کی جائے کہ چونکہ وہ لوگوں کا حق ہے لہذا اس کے بُرے مصرف میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم خود اس "حق" کو قابلِ اعتراض ٹھیرانا چاہتے ہیں۔ اگر سرکار نے کسی شخص کے ساتھ حتمی وعدہ کیا ہے۔ وعدہ درکنار اگر کسی کو محض اس بات کا اُمیدوار بھی بنا دیا ہے کہ سنسکرت یا عربی کے پڑھنے یا پڑھانے کے معاوضہ میں سرکار اس کی کفالت کرے گی تو بیشک ہمیں اس شخص کے وسائلِ معاش کا لحاظ کرنا چاہیئے بلکہ اس بارے میں اگر ہم اسراف

سے کام لیں تو بھی میرے نزدیک بہ نسبت اس کے کہ سرکار کی صداقت پر حرف آئے یہ بے موقع فیاضی بہتر ہوگی لیکن یہ تقریر کہ سرکار خاص خاص علوم والسنہ کو پڑھانے کی پابند ہو چکی ہے (خواہ وہ علوم فرسودہ اور وہ زبانیں بیکار ہی کیوں نہ ہو گئی ہوں) میری دانست میں محض لایعنی ہے اوّل تو کسی سرکاری تحریر میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے ثابت ہو کہ سرکار اس معاملے میں کوئی خاص عہد کر رہی ہے یا اس تعلیمی سرمائے کا ہمیشہ کے واسطے ایک خاص مصرف مقرر کر چکی ہے۔ لیکن اگر ہمارے پیش رو ایسا کر جاتے تو بھی میں کہتا ہوں کہ ان مسائل میں وہ ہمیں اپنی ہدایات کا پابند بنانے کے ہرگز مجاز نہ تھے۔ مثلاً اگر گزشتہ صدی میں کسی حکومت کے اربابِ حل وعقد نے کمال وثوق کے ساتھ یہ قانون نافذ کر دیا ہو کہ اس کی رعایا کے ہر فرد کے ہمیشہ چیچک کا ٹیکا لگایا جایا کرے گا۔ تو کیا ڈاکٹر جینر کے جدید اکتشافات کے بعد بھی اس حکومت کے جانشینوں کو مذکورۂ بالا قانون کی پابندی کرنی فرض ہوگی؟ مجھ سے زیادہ عالی دماغ لوگ ان باتوں کے کچھ معنی سمجھتے ہوں گے ورنہ میرے خیال میں تو ایسے وعدے جن کے ایفا کا کسی کو مطالبہ نہ ہو اور نہ اُن سے مخلصی کی کوئی صورت باقی ہو اور ایسے حقوقِ لاحقہ جو کسی پر لاحق نہ ہوتے ہوں، نیز ایسا تغلّب جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ محض لفظ ہی لفظ ہیں کہ جب کسی بیجا بات کے جواز کی اور کوئی دلیل نہیں ملتی تو ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ اسی قسم کے رسمی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ میں اس ایک لاکھ روپے کے خرچ کو بالکل صاحب گورنر جنرل (معہ کونسل) کی اختیاری شے سمجھتا ہوں کہ وہ اُس طریق پر جو سب سے مناسب معلوم ہو یہ روپیہ ہندوستان میں ترقیِ علوم کے لئے صرف کریں۔ اور اس معاملے میں کہ آیندہ یہ روپیہ عربی وسنسکرت کی اشاعت میں صرف کیا جائے یا نہ کیا جائے، صاحب گورنر جنرل کو میں اسی طرح مختار کار سمجھتا ہوں جس طرح کہ وہ اس قسم کا حکم دینے کے مختار ہیں کہ آیندہ میسور میں شیر مارنے والوں کا انعام کم کر دیا جائے یا کلیسا میں مناجات خوانی کے لئے جو روپیہ سرکار سے دیا جاتا تھا وہ آیندہ موقوف کر دیا جائے۔

اب میں اصل مدعا کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ہمارے پاس ایک سرمایہ اس غرض سے موجود ہے کہ اسے اہلِ ہند کی دماغی ترقی کے کام میں صرف کیا جائے۔ پس اصلی سوال یہ ہے کہ اسے صرف کرنے کی

سب سے بہتر صورت کیا ہو گی ؟

اس بات پر تو ہر فریق کا اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیسی زبانیں جو ہندوستان کے ان حصوں[۱] میں بولی جاتی ہیں اُن میں نہ تو عام ادبی کتابیں ہیں نہ دیگر علوم طبیعی۔ نیز یہ کہ وہ ایسی مفلس اور گنواری ہیں کہ جب تک دوسری زبان سے مدد نہ لی جائے ان میں کسی اعلیٰ درجہ کی کتاب کا ترجمہ کرنا بھی دشوار ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ گویا مسلّم ہے کہ اُن ہندیوں کی دماغی تربیت کے لئے جنھیں اعلیٰ تعلیم کے دیگر ذرائع مُیسّر ہیں ہمیں اس وقت ناچار دیسی زبان کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعۂ تعلیم اختیار کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی زبان ہو ؟

مجلس تعلیمات کے نصف اراکین کی رائے ہے کہ یہ ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہونی چاہیئے لیکن باقی نصف اراکین شدّ و مد کے ساتھ سنسکرت و عربی کی سفارش کرتے ہیں اور میرے نزدیک اصلی فیصلہ طلب امر یہی ہے کہ ان تین میں کون سی زبان سیکھنی سب سے زیادہ مفید اور مناسب ہو گی۔

خود مجھے عربی یا سنسکرت زبان نہیں آتی۔ لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان زبانوں کی قدر قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کروں۔ میں نے سب سے مشہور عربی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے پڑھے ہیں۔ ان زبانوں کے ممتاز عالموں سے یہاں اور انگلستان میں اکثر میری گفتگو ہوئی ہے۔ یہ مستشرقین علوم مشرقی کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں میں اسے بجنسہٖ تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن ان میں آج تک مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو اس بات کا انکار کر سکا ہو کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں قدر و قیمت میں ہندوستان و عرب کے سارے علم ادب کے برابر ہیں! خود مجلسِ تعلیمات کے وہ اراکین جو مشرقی زبانوں کے حامی ہیں۔ مغربی علم ادب کی معنوی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس میں تو شاید کسی کو بھی اختلاف نہ ہو گا کہ علم ادب کی وہ شاخ جسے مشرقی ادیبوں نے سب سے زیادہ کمال کو پہنچایا ہے فنِ شاعری ہے۔ بایں ہمہ مجھے کبھی کسی ایسے مستشرق سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا جس نے دعویٰ کیا ہو کہ سنسکرت یا عربی شاعری کا یورپ کی بڑی بڑی قوموں کی شاعری سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر جب ان خیالی

---

[۱] اِن حصوں سے بنگال و بہار یا جنوبی ہند کے بعض علاقے مراد ہیں۔ "ہندوستان خاص" کے بعض علاقے جن میں فارسی یا اُردو زبان کا رواج تھا اُس وقت تک براہِ راست انگریزوں کے قبضے میں نہیں آئے تھے۔ مترجم

تصانیف کو چھوڑ کر ہم اُن کتابوں کو دیکھتے ہیں جن میں حقائق و واقعات اور عام کلیات قلمبند کیے جاتے ہیں تو میدان میں یورپ والے کہیں آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ انگلستان کے ابتدائی مدارس میں جو چھوٹے چھوٹے تاریخی خلاصے بچوں کو پڑھائے جاتے ہیں ان کی علمی قدر و قیمت اس تمام مجموعی معلومات سے جو ساری سنسکرت کتابوں سے حاصل ہوتی ہے زیادہ ہے۔ دونوں ملکوں میں قریب قریب یہی نسبت دیگر علوم و فنون کی کتابوں میں ہے۔

اب ہمیں اس معاملے پر از سرِ نو نظر ڈالنی چاہیئے کہ ہم ایسے لوگوں کو تعلیم دینی چاہتے ہیں جن کو بالفعل ان کی مادری زبان میں تعلیم دینی ممکن نہیں۔ پس کسی غیر زبان کی تعلیم تو ناگزیر ہے۔ اسی کے ساتھ خود ہماری زبان (انگریزی) کو جو وجوہِ ترجیح حاصل ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ کیوں کہ وہ (یعنی انگریزی) خود یورپ کی زبانوں میں نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اُس میں نظم کی ایسی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جو قدیم یونان کی بہترین ادبی یادگاروں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ تاریخ پر ایسی ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اخلاقی اور قومی تربیت دینے کے معاملے میں تو ان کی کہیں نظیر نہیں ملتی اور محض طرز بیان کے اعتبار سے بھی شاید ہی کوئی کتاب اُن سے بہتر ہوگی اس میں انسانی فطرت اور زندگی کی صحیح اور مُنہ بولتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ مابعد الطبیعات اخلاق، سیاسیات، قانون اور تجارت وغیرہ ہر موضوع پر اس میں نہایت عمیق و جامع کتابیں ہیں۔ ایسے تمام علوم تجربی کے متعلق وافر و صحیح ذخیرہ جمع ہے جو حفظانِ صحت یا اسبابِ راحت کو بڑھاتے اور انسان کی عقل و ذہانت کو ترقی دیتے ہیں۔ جو شخص انگریزی جانتا ہے وہ دماغ انسانی کی اُس بے حساب دولت تک رسائی رکھتا ہے جسے نوّے پشت میں کرۂ ارض کی سب سے عاقل قوموں نے پیدا اور جمع کیا ہے اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں وہ علوم جو زبان انگریزی میں آج موجود ہیں اس تمام مجموعی ذخیرے سے جو تین صدی پہلے دنیا کی ساری زبانوں میں جمع تھا کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہندوستان میں انگریزی حکمران طبقے کی زبان ہے حکومت کے صدر مقامات میں اعلیٰ رُتبے کے دیسی باشندے تک انگریزی بولتے ہیں۔ قرینہ کہتا ہے کہ انگریزی ایشیائی سواحل پر بھی ایک سرے سے دوسرے تک تجارتی زبان ہو جائے گی۔ اُن دونوں یورپین قوموں کی بھی زبان انگریزی ہے جو ایک طرف آسٹریلیا اور دوسری طرف جنوبی افریقہ میں نشو و نما پا رہی ہیں اور ہر سال اُن کا

اثر بڑھتا اور ہماری "سلطنتِ ہند" سے اُن کا تعلق قوی ہوتا جاتا ہے۔ الغرض کیا اپنی معنوی خوبیوں کے اعتبار سے اور کیا ہندوستان کے محل وقوع اور خاص حالات کے لحاظ سے انگریزی زبان ہر طرح ہماری دیسی رعایا کے لئے دوسری تمام غیر زبانوں سے زیادہ مفید و کار آمد ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ہم اس مفید زبان (انگریزی) کی تعلیم دے سکتے ہیں تو کیا پھر بھی ہمیں وہی زبانیں پڑھانی چاہئیں جن میں مسلّمہ طور پر کسی مضمون کی ایسی کتابیں نہیں ہیں جن کا ہماری زبان کی کتابوں سے مقابلہ کیا جا سکے ؟ کیا ایسی صورت میں جب کہ ہم یورپی سائنس کی تعلیم دے سکتے ہیں ہم وہی قدیم علوم پڑھائے جائیں جو کہ جدید علوم سے جہاں کہیں اختلاف رکھتے ہیں وہیں اُن میں نقص ہے۔ کیا ایسی صورت میں جب کہ ہم مفید فلسفے کی اور سچی تاریخ کی ترویج کر سکتے ہیں ہم سرکاری خرچ سے (مثالاً) ایسی طبّی اصول کی تعلیم دینی جائز رکھیں جو ایک انگریز نیم حکیم کے لئے بھی موجبِ عار ہیں، ایسی علم نجوم کی تعلیم دیئے جائیں جسے پڑھکر انگلستان کے زنانہ مدرسے کی لڑکیوں تک کو ہنسی آجائے۔ یا ایسی تاریخ کی جس میں دس دس گز لمبے بادشاہوں کے اور تیس تیس ہزار کے عہد حکومت کے قصّے بھرے ہوئے ہیں۔ یا ایسے جغرافئے کی جس میں مکھن اور شربت کے سمندر لہریں مار رہے ہیں ؟

اس معاملے میں ہماری رہنمائی کے واسطے نظائر بھی موجود ہیں۔ تاریخ میں اسی قسم کی صورتِ حالات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور اُن سب سے ایک ہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ ہم اگر زیادہ دُور نہ جائیں تو قریب ہی کے زمانہ میں دو یادگار مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ ایسی قوموں کی جن میں پہلے جہالت و وحشت کا دَور دَورہ تھا، تھوڑے ہی عرصے میں بالکل کایا پلٹ ہوگئی۔ ان کا جہل و تعصب مٹ گیا بیداری پیدا ہوئی ذوق دُرست ہوگیا اور علم و فن کا قدم ملک میں جم گیا۔ ان میں سے پہلی مثال جس کی طرف میرا اشارہ ہے اُن مغربی اقوام کی ہے جن میں پندرھویں صدی عیسوی کے اخیر اور سولھویں کے آغاز میں علم ادب کا احیا ہوا۔ اُس وقت تمام قابلِ مطالعہ چیزیں قدیم اہلِ یونان و رومہ کی تصانیف میں پائی جاتی تھیں اور اگر ہمارے اجداد بھی مجلس تعلیمات کے مسلک پر عمل کرتے اور ٹیسی ٹس اور سسرو کی زبان کو چھوڑ کر اپنے جزیرہ (برطانیہ) ہی کی پُرانی بولیوں پر ساری توجہ مبذول رکھتے اور اپنے اعلیٰ مدارس میں اینگلو سیکسن زبان کے "وقائع" اور

نارمن فرنچ زبان کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہ پڑھاتے تو کیا انگلستان کو یہ بات میسّر آسکتی تھی کہ آج اس کے علم ادب کا پلہ دَورِ قدیم کی مستند تصانیف (کلاسیکس) سے بھاری ہے؟ اور اُس عہد کے انگریزوں میں جو حیثیت یونانی اور لاطینی زبان کی تھی، وہی موجودہ اہلِ ہند میں ہماری زبان کو حاصل ہے۔ بلکہ سچ پوچھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ ہمارے سیکسن اور نارمن اسلاف کے پاس جیسا علمی سرمایہ تھا، سنسکرت میں اس کے برابر ہے بھی یا نہیں؟ بعض شاخوں میں، مثلاً تاریخ میں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سنسکرت ان قدیم برطانوی السنہ سے بہت گری ہوئی ہے۔

احیاءِ علوم کی دوسری مثال گویا بالکل ہمارے سامنے کی بات ہے گزشتہ ایک صدی کے اندر ایک بڑی قوم جو ایسی وحشیانہ حالت میں تھی جیسے صلیبی لڑائیوں سے قبل ہمارے (یعنی انگریزوں کے) اسلاف جہل کے غار سے آہستہ آہستہ نکل آئی اور مہذب اقوام کی صف میں داخل ہوگئی۔ اس سے میری مراد روس کے لوگ ہیں جہاں اب تعلیم یافتہ افراد کا معقول گروہ ہوگیا ہے اور اس میں ایسے ایسے قابل اشخاص موجود ہیں کہ سلطنت کی بڑی سے بڑی خدمات انجام دے سکتے ہیں اور اپنے اُن معاصرین سے جو پیرس و لندن کے بہترین حلقوں کی زیب و زینت ہیں کسی بات میں کم نہیں۔ اور یہ توقع کرنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ یہ وسیع سلطنت (روس) جو ہمارے دادا پردادا کے وقت میں غالباً ملکِ پنجاب سے بھی پس ماندہ تھی، ہمارے پوتے پر پوتوں کے زمانہ میں بہ اعتبار ترقی فرانس و برطانیہ سے ٹکّا کھانے لگے گی۔ لیکن روس کے اس نمایاں تغیر کا سبب یہ نہیں ہے کہ قومی تعصبات کی تائید کی گئی یا روسی لڑکوں کو بڑی بوڑھیوں کی وہ کہانیاں اور سینٹ نکولاس کے وہ جھوٹے کارنامے سنائے گئے جنھیں ان کے جاہل اسلاف مانتے تھے۔ یا ایسے باریک مسائل کی تحقیقات کا انھیں شوق دلایا گیا کہ دُنیا تیرہ ستمبر کے دن پیدا ہوئی تھی یا اور کسی دن اور پھر جو شخص ان علمی رموز سے واقف ہوا اسے "دیسی فاضل" کا لقب دیدیا گیا۔ نہیں بلکہ درحقیقت اہل روس میں یہ انقلاب اُن غیر زبانوں کی تعلیم سے پیدا ہوا ہے جن میں معلومات کے بہترین ذخیرے بھرے ہیں اور جب روسیوں نے یہ (مغربی یورپ کی) زبانیں سیکھیں تو اس علمی ذخیرے تک اُن کی دسترس ہوگئی اور وہ شائستہ قوم بن گئے اور مجھے اس میں ذرہ شبہ نہیں کہ ان مغربی السنہ نے جو کام روسی تاتار کے حق میں کیا وہی ہندو (یعنی اہلِ ہند)

کے حق میں کر دکھائیں گی۔

غرض عقل و تجربہ دونوں اسی طرزِ عمل کو پسندیدہ ٹھیراتے ہیں لیکن اختلاف کرنے والوں کا قول ہے کہ ہمیں تعلیمی معاملات میں اپنی دیسی رعایا کو ہم آہنگ بنانا ضروری ہے اور یہ بات صرف عربی اور سنسکرت کی تعلیم دینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس کے جواب میں سب سے اوّل تو مجھے یہ تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ جب ایک ترقی یافتہ قوم کسی پس ماندہ اور کم علم قوم کی تعلیم کا انتظام اپنے ذمہ لے تو پھر بھی طریق تعلیم کا انحصار اسی پس ماندہ اور سیکھنے والی قوم کی رائے پر رکھا جائے۔ مگر اس سے قطع نظر سچ پوچھئے تو مذکورۂ بالا دلیل پر کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کیوں کہ اس امر کی مسکت شہادت موجود ہے کہ موجودہ طریق تعلیم میں دیسی رعایا ہماری ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہ بات بجائے خود ناپسندیدہ ہے کہ ہم لوگوں کے ذوق کی خاطر اُن کی دماغی صحت کا لحاظ نہ کریں۔ لیکن زیر بحث معاملے میں تو ہمیں اُن کے ذوق کی پروا ہے نہ صحت کی۔ اس لئے کہ ہم صریحاً لوگوں کو وہ تعلیم دے رہے ہیں جس سے وہ بیزار ہیں اور اُس تعلیم کے دینے میں بخل کر رہے ہیں جس کی انھیں دلی تمنّا ہے۔ ثبوت اس قول کا یہ ہے کہ ہمیں عربی اور سنسکرت پڑھنے والوں کو تو وظیفے دے دے کے پڑھانا پڑتا ہے اور انگریزی پڑھنے والے خود روپیہ دے دے کے ہم سے پڑھنے پر تیار رہیں۔ اور صرف یہی مسلّم واقعہ کہ ہمیں اپنے وسیع مقبوضات میں ایک طالب علم بھی ایسا نہیں مل سکتا جو بغیر کچھ روپیہ لئے ہم سے اپنی مقدس زبانیں سیکھنی جائز رکھتا ہو، منصف مزاج آدمی کی نظر میں یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ سنسکرت و عربی سے لوگوں کی عقیدت اور ذوق شوق کے متعلق جو تقریریں کی جا رہی ہیں وہ کچھ وزن نہیں رکھتیں۔

اس وقت مدرسۂ کلکتہ کے ایک مہینے (دسمبر ۱۸۳۳ء) کے حسابات میرے سامنے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی پڑھنے والوں کی تعداد ستتر ۷۷ تھی۔ ان میں سے ہر ایک کو سرکاری وظیفہ ملتا ہے جس کا کل خرچ پانسو روپیہ مہینے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف درج ہے کہ خرچ کی میزان میں سے نفی ایکسو تین جو انگریزی پڑھنے والے (بیرونی) طلبہ سے گزشتہ مئی، جون اور جولائی میں وصول ہوا۔

بعض صاحبوں نے مجھے جتایا کہ چوں کہ مجھے اس ملک کا تجربہ اور حالات سے واقفیت نہیں، اس لئے

طلبہ کا اس طرح وظائف لے کر پڑھنا دیکھکر میں حیران ہوا۔ حالاں کہ ہندوستان میں یہ دستور ہی نہیں کہ طالب علم اپنے خرچ سے تعلیم حاصل کریں۔ مگر یہ سُن کر مجھے اُلٹا اپنی رائے میں زیادہ وثوق ہوگیا کیوں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ دنیا کے کسی حصّے میں بھی ایسا کام کرنے کے واسطے جسے لوگ اچھّا اور فائدہ مند سمجھتے ہیں، اُن کو روپیہ دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہندوستان اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو بھی جب بھوکے ہوتے ہیں تو چاول کھلانے کے لئے یا سردی میں اُدنی کپڑا پہنانے کے لئے روپیہ دینا نہیں پڑتا۔ اس سے بھی قریب تر مثال یہ ہے کہ وہ بچے جو دیہاتی اُستاد سے الف بے تے اور ابتدائی حساب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، کوئی وظیفہ اپنے اُستاد سے نہیں پاتے بلکہ خود اُستاد کو معاوضہ دیتے ہیں تو پھر عربی اور سنسکرت پڑھنے کے لئے لوگوں کو وظیفہ دینا ضروری کیوں ہے؟ صریحًا اس وجہ سے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ان زبانوں کی تحصیل سے کوئی ایسا فائدہ نہیں ہوتا جو اس دردسری کا کافی صلہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے سب معاملات میں اصلی فیصلہ بازاری مانگ دیکھکر ہوتا ہے[۵]۔

بایں ہمہ اگر مزید شہادت کی ضرورت ہو تو وہ بھی موجود ہے:-

گزشتہ سال ہی سنسکرت کالج کے چند قدیم طلبہ نے مجلس تعلیمات کو ایک عرضی دی تھی کہ عرضی گزاروں نے دس بارہ سال تک اس کالج میں تعلیم پائی۔ ہندو علوم وفنون سے واقفیت بہم پہنچائی اور فارغ التحصیل ہونے کی سند حاصل کی۔ لیکن اس سب کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ لکھتے ہیں کہ ان تمام اسناد کے باوجود ہمیں اس بات کی بہت کم اُمید ہے کہ مجلس تعلیمات کی دستگیری کے بغیر ہم اپنی فلاح کی کوئی صورت نکال سکیں گے۔ کیوں کہ ہمارے ہم وطن جس بے پروائی سے ہمارے ساتھ پیش آتے ہیں اسے دیکھکر ذرا بھی توقع نہیں رہتی کہ وہ ہماری کوئی ہمت افزائی یا امداد کریں گے۔ لہٰذا عرضی گزار درخواست کرتے ہیں کہ لاٹھ صاحب کے پاس اُن کی سفارش

---

[۵] مکالے کے ان نتائج پر غالبًا یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ ممالکِ مشرقی میں اعلیٰ تعلیم ایک مذہبی نوعیت رکھتی تھی اور اس کے استاد یا طلبہ مالی فوائد کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔ اگر بادشاہ یا اُمرا کی طرف سے اس تعلیم کا انتظام ہوتا تھا تو وہ طلبہ کے قیام وطعام کا بندوبست کرنا بھی پسندیدہ اور موجب ثواب جانتے تھے۔ خود اُستاد شاگردوں سے کسی قسم کی فیس یا مالی معاوضہ لینا گوارا نہ کرتے تھے اور طلبہ کے شوقِ علم کی دلیل یہ ہے کہ وہ تعلیم کے واسطے دُور دراز کے سفر اور ہر قسم کی مشقت وعسرت کو خوشی سے برداشت کرلیتے تھے۔ مترجم

کردی جائے کہ کوئی سرکاری ملازمت مرحمت فرمائیں اور کوئی اعلیٰ یا بڑی تنخواہ کی ملازمت نہ ہو بلکہ صرف ایسی کہ اُن کی بسر اوقات کے لئے کافی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم صرف بھلے آدمیوں کی طرح زندگی گزارنے اور تدریجی ترقی کرنے کا وسیلہ ڈھونڈھتے لیکن سرکار کی مدد کے بغیر جس نے ہمیں لڑکپن سے پرورش کیا اور تعلیم دیوائی ہے ہمیں کوئی وسیلہ نہیں ملتا۔ اور آخر میں وہ بہت درد انگیز پیرائے میں لکھتے ہیں کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ سرکار کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ زمانۂ تعلیم میں اس قدر فیاضانہ برتاؤ کرنے کے بعد آخر میں ہمیں ایسی بیکسی کی حالت میں چھوڑ کر خود الگ ہو جائے!

سرکار کے نام عرضیاں تو میں نے بہت دیکھی ہیں جن میں عرضی گزار (بعض اوقات خواہ مخواہ بھی) کسی ایسے ضرر یا نقصان کی تلافی چاہتے ہیں جو اُن کے خیال میں اُنھیں سرکار سے پہنچا ہو۔ لیکن بے شبہ یہ پہلے عرضی گزار ہیں جو مفت میں تعلیم پانے کا معاوضہ طلب کر رہے ہیں۔ یعنی اس بات پر کہ ہم نے انھیں بارہ برس تک وظیفہ دیا اور پڑھا لکھا کے دنیا میں داخل کیا وہ اُلٹا ہمیں سے تاوان مانگتے ہیں! بہ الفاظ دیگر وہ اپنی تعلیم کو ایک ضرر کی صورت میں پیش کرتے ہیں جس کی تلافی چاہنے کا اُن کو حق ہے اور جس کا وہ وظائف کسی طرح کافی معاوضہ نہ تھے جو اس ضرر رسی کے دَوران میں انھیں ملتے رہے! میں کہتا ہوں کہ بے شک اُن کا دعویٰ ٹھیک ہے۔ انھوں نے زندگی کا بہترین زمانہ ایسی تعلیم میں صرف کیا جس سے نہ انھیں روٹی ملتی ہے نہ عزت۔ ان لوگوں کو نکما بنانے اور مصیبت میں پھنسانے سے تو بہتر تھا کہ ہم اُن پر اتنا روپیہ خرچ نہ کرتے۔ لوگوں کو اپنے ہموطنوں پر ایک بوجھ اور ہمسایوں کی نظر میں حقیر بنانا ایسا کون سا بڑا کام ہے جس کے لئے سرکار کو اتنا روپیہ صرف کرنا ضروری ہو؟ لیکن ہماری حکمت عملی ہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش میں ہم ایک طرف علیحدہ بھی کھڑے نہیں رہتے اور اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ اہل ہند اپنے موروثی اوہام و تعصب کے اثرات میں مبتلا رہیں۔ بلکہ ہم اُن قدرتی مشکلات میں جو ایشیا میں سچے علم کی سدّراہ ہیں اپنی طرف سے اضافہ کر رہے ہیں اور جھوٹے علوم اور جھوٹے ذوق کے واسطے اس طرح بے دریغ وظائف و انعامات دے رہے ہیں کہ سچی تعلیم کی اشاعت کے لئے بھی اتنا اسراف نہیں کرنا چاہیئے۔

پھر یہ کہ اس طرزِ عمل سے ہم اپنے لئے اُسی پریشانی کا سامان کر رہے ہیں جس سے بچنے کے واسطے ہم نے

بزعم خود یہ طرز عمل اختیار کیا ہے۔ یعنی ہم اُن لوگوں میں جواب تک مخالف نہیں اپنی مخالفت کے اسباب پیدا کر رہے ہیں۔ عربی اور سنسکرت کے مدرسوں پر روپیہ خرچ کرنا فقط حق کو امانت سے محروم رکھنا ہی نہیں بلکہ باطل اور خطا کے حامی پیدا کرنے کے لئے انعام بانٹنا ہی۔ اس خرچ سے ہم اُن لوگوں کا جتھا تیار کر رہے ہیں جو محض نالایق نوکری کے بھکاری اور ساتھ ہی سخت متعصب بھی ہوں گے اور اسی تعصب اور ذاتی اغراض کی بنا پر تعلیم کی ہر مفید تجویز کے خلاف ہنگامہ بپا کر دیا کریں گے۔ اس وقت بھی اگر موجودہ طرز تعلیم کو بدلنے کی دیسی لوگوں میں مخالفت ہو تو وہ خود ہمارے طرزِ عمل کا نتیجہ ہو گی اور اس میں پیش پیش وہی لوگ ہوں گے جو ہم سے وظائف اور ہمارے مدارس میں تعلیم پاتے رہے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ عرصہ تک ہم اپنے موجودہ طریق پر کاربند رہیں گے۔ اسی قدر زیادہ یہ مخالفت قوی ہوتی جائے گی۔ سال کے سال مخالفین کی فوج میں نئے سپاہیوں کا جنھیں تنخواہ ہم دے رہے ہیں، اضافہ ہوتا رہیگا۔ خلاصہ یہ کہ دیسی باشندوں کو اگر ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو کوئی دشواری پیش آنے کا اندیشہ نہیں۔ جو کچھ چُناں چنیں ہو گی وہ اسی گروہ کی طرف سے ہو گی جس کے اغراض مشرقی تعلیم سے وابستہ ہیں اور جسے خود ہم نے مصنوعی تدابیر سے پیدا کیا اور قوت پہنچائی ہی۔

ان سب باتوں کے علاوہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خود اہلِ ہند کے وہ خیالات نہیں جو قدیم علوم کے حامی بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی کافی ہی کہ مجلس تعلیمات نے تو عربی اور سنسکرت کتابیں چھاپنے کے واسطے ایک لاکھ سے کچھ اوپر روپیہ صرف کرنا ضروری سمجھا تھا لیکن اب ان کتابوں کے خریدار مُیسّر نہیں آتے۔ شاذونادر کوئی نسخہ فروخت ہوتا ہی ورنہ مجلس کی الماریاں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ گودام، اُن تیس ہزار کتابوں سے (کہ اکثر بڑی سے بڑی تقطیع پر چھپی ہیں) پٹے پڑے ہیں۔ ہر چند مجلس مختلف تدبیریں نکالتی ہی کہ اس انبار عظیم سے کچھ تو سُبک دوشی حاصل ہو لیکن وہ جس تیزی سے کتابیں چھاپ رہی ہے اس تیزی سے تقسیم نہیں کر سکتی اور ہر سال انھیں ردّی کاغذوں کے تازہ انبار جمع کرنے میں بیس ہزار کے قریب روپیہ خرچ ہوتا رہتا ہے حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم پہلے ہی اتنا بڑا ڈھیر جمع کر چکے ہیں کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ مجموعی طور پر گزشتہ تین سال میں تقریباً ساٹھ ہزار روپیہ اس طریق پر صرف ہوا لیکن اس

مدت میں کتابوں کی فروخت سے آمدنی پوری ایک ہزار کی بھی نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں اسکول بُک سوسائٹی انگریزی کی سات آٹھ ہزار کتابیں ہر سال فروخت کرلیتی ہے اور اسے نہ صرف مصارف طبع وصول ہوجاتے ہیں بلکہ اپنے سرمایہ پر ۲۰ فیصدی کا منافع بھی حاصل ہو رہا ہے۔

بعض حضرات اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ ہندوؤں کے قوانین بیشتر سنسکرت کتابوں سے اور اسلامی قانون کتب عربیہ سے سیکھا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک اس بات کا مسئلہ زیر بحث پر کوئی اثر نہیں۔ پارلیمنٹ ہمیں حکم دے چکی ہے کہ ہندوستان کے قوانین کی تحقیق و تنقیح کی جائے۔ ہماری مدد کے لئے تحقیقات قوانین کی ایک خاص جماعت (کمیشن) بھی مقرر ہوئی ہے۔ پس جب ہمارا نیا مجموعۂ قوانین مُرتب اور نافذ ہوجائیگا تو کسی منصف یا صدر امین کو شاستروں کی یا ہدایہ کی ضرورت نہیں رہیگی۔ اور مجھے توقع اور پورا بھروسہ ہے کہ وہ لڑکے جو اس وقت عربی یا سنسکرت کالج میں داخل ہو رہے ہیں اپنی تعلیم پوری نہ کرنے پائیں گے کہ مذکورۂ بالا کام کی تکمیل ہو جائے گی۔ نظر برایں کونسل کو اُن حالات کے مطابق تعلیم دینے کا انتظام کرنا، جن کو ہم ان لڑکوں کے جوان ہونے سے پہلے بدل دینا چاہتے ہیں، صریحاً فضول ہے۔

مشرقی علوم کی حمایت میں ایک اور دلیل پیش کی جاتی ہے جو اور بھی کمزور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عربی اور سنسکرت وہ زبانیں ہیں جن میں تقریباً دس کروڑ نفوس کی مقدس (آسمانی) کتابیں لکھی ہوئی ہیں اور اس بناپر ان زبانوں کی بہ تخصیص قدر ہونی چاہیئے۔ لیکن ہندوستان میں اگر سرکار انگریزی کا فرض ہے کہ تمام مذہبی معاملات میں رواداری سے کام لے تو اسی کے ساتھ اُس کو بالکل غیر جانب دار بھی رہنا چاہیئے۔ پس ایسی زبانوں کی تعلیم کو فروغ دینا جو بذات خود تو کچھ قابل قدر نہیں، البتہ اُن میں سب سے اہم مسائل (یعنی مسائل الٰہیات) میں سب سے سنگین غلطیاں پائی جاتی ہیں، کسی عقل و اخلاق اور اس غیر جانب داری کے بھی مطابق نہ ہوگا جسے نہایت احتیاط کے ساتھ قایم رکھنے پر ہم سب متفق ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ؎

؎ اس کے آگے مکالے نے پھر اسی خیال کی وضاحت کی ہے اور اہل ہند کے مذاہب کو صاف صاف لفظوں میں جھوٹا قرار دیا ہے۔ اُس کے اعتراضات کا اصلی ہدف ہندو مذہب معلوم ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مترجم کو ان خیالات سے کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا اور اسی لئے اس فقرے کی باقی ۶ ، ۷ سطریں جن میں مکالے نے اپنے تعصب کو بہت نازیبا طریق پر ظاہر کیا تھا۔ حذف کردی گئیں۔

مشرقی تعلیم کے حامیوں نے اس بات کو بالکل مُسلّم سمجھ لیا ہی کہ ہندوستان کا کوئی باشندہ انگریزی زبان میں سوائے شُد بُد کے زیادہ مہارت حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ مگر اس خیال کا جو اُن کی تحریر میں جا بجا جھلکتا ہے انھوں نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا انگریزی زبان کے حامی جس تعلیم کی سفارش کرتے ہیں اُسے یہ مخالف حضرات محض ابتدائی تعلیم بتاتے ہیں اور اسی لئے انھوں نے فرض کر لیا ہی کہ اس موقع پر ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ مشرقی تعلیم اور محض ابتدائی انگریزی تعلیم کا مقابلہ کرنا ہے۔ مگر اُن کا یہ خیال محض وہم اور وہم بھی سراسر عقل اور تجربہ کے خلاف ہی۔ سب قوموں کے لوگ ہماری زبان سیکھتے ہیں اور اس قدر کافی واقفیت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ اس کے دقیق و خاص مضامین تک اُن کی رسائی ہو جاتی ہے اور ہمارے انشا پردازوں کی با محاورہ سے با محاورہ تحریر کے لطیف ترین کنایات اور حسن بیان کا وہ مزا لینے لگتے ہیں۔ خود اس شہر (کلکتہ) میں ایسے دیسی موجود ہیں جو ہر قسم کے سیاسی اور علمی مضامین پر انگریزی زبان میں نہایت روانی اور صحت کے ساتھ بحث کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر مسئلہ پر ہی میں نے بعض دیسی حضرات کو ایسی گفتگو کرتے سنا کہ مجلس تعلیمات کے فاضل اراکین بھی اگر اتنے وسیع الخیال اور باخبر ہوں تو اُن کے لئے موجب مباہات ہی۔ حتیٰ کہ یورپ کے ادبی حلقوں میں بھی ایسے غیر ملکی شاذونادر ہی ملیں گے جو انگریزی زبان میں اتنی صحت و سہولت سے اپنا مطلب ادا کر سکیں جس طرح کہ اکثر ہندوؤں کو ہم نے ادا کرتے دیکھا ہے۔ یہ دعویٰ تو شاید کوئی بھی نہ کرے گا کہ انگریزی زبان ہندوؤں کے لئے اتنی دشوار ہے جتنی کہ انگریزوں کے لئے یونانی۔ تاہم ایک ایک ہوشیار انگریز لڑکا اس مدت سے جو ہمارے بدنصیب ہندی طلبہ کو سنسکرت کالج کا امتحان دینے میں درکار ہوتی ہے۔ کہیں کم وقت میں یونانی سیکھ لیتا ہی اور یونانی کے بہترین مُصنّفین کی انشا پردازی کا نہ صرف لطف اُٹھاتا ہی بلکہ اپنی تحریر میں خاص طرح اُن کی نقل بھی اُڑانے لگتا ہی۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جتنے عرصہ میں ایک انگریز طالب علم ہیرودوٹس اور سفاکلیس کی کتابیں پڑھنے کے لائق یونانی سیکھ سکتا ہے اس سے نصف یا اور بھی کم مدت میں ایک ہندو (یعنی ہندی طالب علم) کو اتنی انگریزی نہ آجائے کہ وہ ہیوم اور ملٹن کا مطالعہ کر سکے۔

جو کچھ میں نے عرض کیا اس سب کا خلاصہ یہ ہی کہ نہ تو ہم (یعنی سرکارِ انگریزی) قانون پارلیمنٹ مجریہ ۱۸۱۳ء کی رو سے مجبور ہیں اور نہ کسی علانیہ یا مضمر عہد کی بنا پر پابند ہیں کہ موجودہ تعلیم کو ہمیشہ جاری رکھیں۔

برخلاف اس کے ہمیں پورا اختیار ہے کہ اپنے تعلیمی سرمایہ کو جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ پس ہمیں یہ روپیہ اُنھی علوم کی تعلیم پر خرچ کرنا چاہیئے جو سب سے زیادہ مفید و کارآمد ہیں اور یہ ثابت ہے کہ سنسکرت اور عربی کی نسبت انگریزی کا جاننا زیادہ مفید اور مناسب ہی۔ خود دیسی باشندے انگریزی سیکھنے کے خواہاں ہیں اور سنسکرت یا عربی پڑھنی نہیں چاہتے اور قانونی یا مذہبی زبانیں ہونے کے اعتبار سے بھی عربی یا سنسکرت کسی خاص توجہ کی مستحق نہیں ہیں۔ نیز یہ بالکل ممکن ہی کہ ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت حاصل ہو جائے اور یہی ہماری کوششوں کا مقصود و مدعا ہونا چاہیئے۔

طرزِ تعلیم کے متعلق جن صاحبوں کے عام خیالات سے میں نے اختلاف کیا۔ ایک بات میں اُن سے میں بالکل متفق ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارا موجودہ سرمایہ اس قدر کافی نہیں ہے کہ ہم جمہور اہلِ ہند کی تعلیم کا اہتمام کرسکیں پس ہمیں سردست صرف یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ایک گروہ ایسے تعلیم یافتہ ہندیوں کا تیار کر دیں جو ہمارے اور ہماری کثیر التعداد رعایا کے درمیان ترجمان کا کام انجام دے سکے۔ یہ نئے تعلیم یافتہ رنگ و خون کے اعتبار سے ہندی لیکن اپنے ذوق اور افکار و اخلاق کے لحاظ سے انگریز ہوں۔ ملک کی دیسی زبانوں کی تہذیب و ترقی کا کام بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے کہ مغربی لغات سے علمی اصطلاحات لے لیکر اپنی دیسی زبانوں کو مالا مال کریں اور بتدریج اس قابل بنا دیں کہ انھیں کے ذریعے عوام تک علوم کو پہنچایا جا سکے۔

قدیم طریقِ تعلیم سے جن لوگوں کی مالی اغراض وابستہ ہیں میں اُن کے حقوق کا پوری طرح لحاظ رکھنا چاہتا ہوں اور ان سب کے ساتھ بھی فیاضانہ سلوک کرنے کا خواہاں ہوں جو معقول وجوہ کی بنا پر سرکار سے اپنی کفالت کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی میں اُس ناقص نظام کی بالکل بیخ کنی کر دینی چاہتا ہوں جسے اب تک ہم نے قایم اور سرسبز رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بلا تاخیر عربی اور سنسکرت کتب کا چھاپنا موقوف اور کلکتہ کا مدرسہ اور سنسکرت کالج بند کر دیئے جائیں۔ برہمنی تعلیم کا بڑا مرکز بنارس اور علوم عربیہ کا صدر مقام دہلی ہی۔ لہذا اگر ہم بنارس کے سنسکرت کالج اور دہلی کے اسلامی کالج کو بحالِ خود قایم رکھیں تو میرے نزدیک یہ مشرقی السنہ کی کافی بلکہ کافی سے زیادہ رعایت ہی اور ان دونوں کالجوں کو جاری رکھنے کی

صورت میں بھی میری تجویز یہ ہے کہ ان کے طلبہ کو سرکاری وظیفہ دینا بند کر دیا جائے اور لوگوں کو ایسی تعلیم کے لئے جس کے وہ خواہاں نہیں، سرکار کی طرف سے کوئی رشوت نہ دی جائے اب یہ اُن کی مرضی کہ قدیم یا جدید علوم کی تعلیم میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔ اس طرح جو سرمایہ ہمارے پاس بچیگا وہ کلکتہ کے ہندو کالج (انگریزی) کو پہلے سے زیادہ امداد دینے میں اور صوبۂ بنگالہ و آگرہ کے تمام بڑے بڑے مقامات پر ایسے مدارس قایم کرنے میں کام آئے گا جن میں انگریزی زبان کی عمدہ طریق پر تعلیم دی جائے۔

اب اگر گورنر جنرل باجلاس کونسل اس معاملہ میں وہی فیصلہ کریں جس کی مجھے اُمید ہے تو میں مجلس تعلیمات کی صدارت کے فرایض نہایت خوشی اور مستعدی کے ساتھ انجام دینے میں مشغول ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر سرکار کی رائے یہ قرار پائے کہ موجودہ طریق تعلیم بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہے تو میری درخواست ہے کہ مجھے مجلس تعلیمات کی صدارت سے مستعفی ہونے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ کیوں کہ اس صورت میں میرا اس عہدے پر رہنا بالکل بے سود ہوگا بلکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں ایک ایسے کام میں معاون رہوں جو میرا پختہ یقین ہے کہ محض دھوکا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ طریق تعلیم حق و صداقت کی اشاعت میں کوئی تقویت نہیں پہنچاتا بلکہ اُلٹا اُن اوہام باطلہ کو جو اپنی قدرتی موت مر رہے ہیں مرنے سے روکتا ہے۔ بحالتِ موجودہ میں خیال کرتا ہوں کہ ہمیں "مجلس تعلیماتِ عامہ" کا معزز لقب اختیار کرنے کا بھی استحقاق نہیں۔ ہماری مجلس تو محض لوگوں کا روپیہ ضائع کرنے اور ایسی کتابیں چھاپنے کے لئے ہے جو اتنی قیمت بھی نہیں رکھتیں جتنی کہ چھپنے سے پہلے اُن کا (سادہ) کاغذ رکھتا تھا! وہ (یعنی مجلس) مہمل تاریخ، مہمل طبعیات اور مہمل مابعد الطبیعات کی زبردستی ترویج میں کوشاں ہے اور ایسے فاضلوں کی اُمت تیار کر رہی ہے جن کے حق میں یہ تعلیم ایک مصیبت اور فضیحت ہے۔ جو طالب علمی کے زمانہ میں تو سرکاری خرچ سے پلتے ہیں اور پھر اُن کی تعلیم اس قدر نکمی ہوتی ہے کہ اس کی تحصیل کے بعد یا تو سرکار ہی ساری عمر اُن کی پرورش کرے اور یا وہ بھوکے رہ جائیں۔

جب کہ میرے خیالات یہ ہیں تو پھر قدرتی بات ہے کہ میں ایسی جماعت میں شریک ہونا پسند نہیں کر سکتا جو اپنے سارے طرزِ عمل کو بدلے بغیر میرے نزدیک نہ صرف بیکار بلکہ یقیناً نقصان رساں ہے۔

تلمیحات

از

جناب مولوی سیّد وحید الدین صاحب سلیم
پروفیسر اُردو۔ عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن

(جولائی نمبر سے آگے)

ادبی تلمیحاتِ قسمِ اوّل میں جو تلمیحات درج کی گئی ہیں، وہ بطور مثال کے ہیں۔ تمام تلمیحات کا استیعاب نہیں کیا گیا۔ یہ کام اُس مصنف کا ہے، جو تلمیحات کی فرہنگ مرتب کرے۔ اب ہم اُن تلمیحات پر توجہ کی نظر ڈالتے ہیں، جو قسمِ دوم میں داخل ہیں اور یہ وہ تلمیحات ہیں، جن میں ایرانی اثر پایا جاتا ہے۔

اُردو ادبی تلمیحات (قسمِ دوم)

جمشید ایران کا ایک مشہور بادشاہ تھا، جو عیش و عشرت اور شان و شوکت کے لحاظ سے بار بار مذکور ہوا ہے۔ اُس کو جم بھی کہتے ہیں۔ مگر جم کے لفظ سے شعرا کبھی حضرت سلیمان مراد لیتے ہیں، کبھی سکندر اور کبھی ایران کے اس نامور بادشاہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ خاتمِ جم۔ نگینِ جم۔ انگشترِ جم۔ تختِ جم کی تلمیحوں میں اس لفظ سے حضرت سلیمان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آئینۂ جم میں سکندر مراد ہے۔ بزمِ جم۔ جامِ جم۔ جشنِ جم۔ ساغرِ جم میں ایران کے بادشاہ جمشید کی طرف اشارہ ہے۔ ان تلمیحات میں جم کی جگہ جمشید کا لفظ بھی لایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس بادشاہ کے پاس شراب کا ایک جام تھا۔ اس کے گرد سات خط کھنچے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے خط یعنی بالائی خط تک شراب بھری جاتی روانہ ہوا، ساتوں منزلیں،

کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس پیالہ کو پی سکے۔ پہلے خط یعنی کنارے کے خط کا نام خطِ جور ہے۔ باقی چھ خطوط کے نام ترتیب وار حسب ذیل ہیں۔ خطِ بغداد۔ خطِ بصرہ۔ خطِ ارزق جس کو خطِ سیاہ۔ خطِ شب اور خطِ سبز بھی کہتے ہیں۔ خطِ شکر یا خطِ اشک۔ خطِ کاسہ گر۔ خطِ فرودینہ۔ تختِ جمشید جو ایران کے آثار قدیمہ میں سے ایک عالی شان عمارت ہے اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔

ایک اور بادشاہ جس نے ایران پر حکومت کی، ضحاک تھا۔ یہ اپنے ظلم وستم اور خوں ریزی کے سبب بدنام ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے دونوں شانوں پر دو سانپ پیدا ہوگئے تھے۔ اُن کی غذا کے لئے انسان کا گوشت درکار تھا۔ ضحاک ہر روز انسانوں کو ہلاک کرتا اور ان سانپوں کے لئے خوراک بہم پہنچاتا تھا۔ مارِ ضحاک سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ بادشاہ فریدوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

فریدوں اپنی عظمت وصولت کے سبب مشہور ہے۔ جب شاعر کسی بادشاہ کی تعریف کرتے ہیں، تو اُس کو فریدوں فر کہا کرتے ہیں۔ ضحاک کے عہد حکومت میں ایک لہار تھا، جس کا نام کاوہ تھا۔ یہ لہار اصفہان کا باشندہ تھا اس کے چار بچے ضحاک نے مروا ڈالے تھے۔ خلقت ضحاک کے جور وستم سے عاجز آگئی تھی۔ کاوہ کے دل میں ان واقعات کو دیکھ کر جوش پیدا ہوا۔ اُس نے دکان بند کر دی۔ جس چمڑے کو وہ اہرن کے نیچے بچھایا کرتا تھا، اُس کو ایک لکڑی پر آویزاں کرکے پھریرا بنایا اور ڈھول بجاتا، ضحاک کے ظلم کے راگ گاتا نکل کھڑا ہوا۔ اس جھنڈے کو درفشِ کاویانی کہتے ہیں۔ علم کاویانی۔ پرچم کاویانی۔ اختر کاویانی کے الفاظ سے بھی یہی جھنڈا مراد ہے۔ ایران کے باشندے جو ضحاک کے ظلم وستم سے تنگ آگئے تھے، اس جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔ کاوہ اس لشکر کو اپنے ساتھ لے کر بڑھا۔ ضحاک کی فوجوں سے اُس کی ٹکر ہوئی۔ ان فوجوں نے شکست کھائی۔ یہاں تک کہ تمام ایران کو کاوہ نے فتح کر لیا۔ اُس نے بذاتِ خود سلطنت کرنے سے انکار کیا۔ فریدوں جو جمشید کا بیٹا تھا اور جس کا باپ ضحاک کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا، تختِ ایران پر بٹھایا گیا۔ تمام لڑائیوں میں درفشِ کاویانی فوج کے آگے رہتا تھا۔ پے در پے فتوحات نے یہ بات ذہن نشین کر دی کہ یہ جھنڈا بہت مبارک ہے۔ کاوہ کے مرنے کے بعد فریدوں نے اور فریدوں کے بعد بادشاہوں نے اس جھنڈے کو جواہرات سے مرصع کیا۔ یزدجرد کے زمانے تک یہ جھنڈا ہر لڑائی آگے چلتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ جھنڈا مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اُس کے جواہرات تقسیم

کر دیئے گئے اور چمڑا جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔

کیخسرو ایران کا ایک اولوالعزم فرماں روا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ایک پیالہ بنایا تھا۔ اُس پر ہندسی خطوط کھچے ہوئے تھے۔ جس طرح اصطرلاب کے خطوط سے تاروں کا ارتفاع وغیرہ معلوم ہوتا ہے، اسی طرح اس جام کے خطوط سے تاروں کی گردش نمایاں ہوتی تھی اور زمانے کے آیندہ واقعات اس سے معلوم کیئے جاتے تھے۔ اس جام کی طرف جو اشارے ہمارے شعرا نے کیئے ہیں، اُن کے لیئے حسبِ ذیل الفاظ تراشے گئے ہیں:-

جامِ کیخسرو۔ جامِ جہاں نما۔ جامِ جہاں بیں۔

کیانیوں کے عہدِ حکومت میں ایران اور توران کے درمیان ہمیشہ معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ ایرانیوں کی حمایت میں سیستان یا زابلستان کے ایک پہلوان نے اپنے شاندار کارناموں سے بڑی شہرت حاصل کی اِس پہلوان کا نام رستم تھا۔ رستم کو پیلتن اور تہمتن بھی کہتے ہیں۔ یہ زال کا بیٹا تھا، اِس لیئے پورِ زال کے لفظ سے بھی یہی پہلوان مُراد ہے۔ شاہ نامۂ فردوسی کا ہیرو یہی رستم ہے۔ رستم کے ہاتھ میں گرز رہتا تھا، جو گرزِ رستم کے نام سے مشہور ہے۔ چوں کہ یہ گرز بیل کے سر سے مشابہ تھا، اس لیئے اِسے گرزِ گاؤ سر بھی کہتے ہیں۔ اُس کے گھوڑے کا نام رخش ہے۔ سہراب اسی کے بیٹے کا نام تھا۔ اتفاق سے دونوں باہم جنگ آزما ہوئے اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ جب رستم کے ہاتھ سے سہراب زخمی ہو چکا، تو اس راز سے آگاہ ہُوا۔ مگر واقعہ لاعلاج تھا۔ افراسیاب جو توران کا بادشاہ تھا اس کے لشکر سے بار بار رستم کے مقابلے ہوئے۔ کیکاؤس جو ایران کا نہایت مشہور بادشاہ تھا، اُسے ایک دفعہ دیووں نے گرفتار کر کے مازندران کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ رستم اِس بادشاہ کو قید سے چھڑانے کے لیئے گیا۔ رستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ ہر منزل میں ایک نئی ہول ناک مُصیبت و تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ سات منزلیں شاہ نامہ کی زبان میں ہفتخواں کے نام سے مشہور ہیں۔ ہفتخواں کو طے کر کے رستم کیکاؤس کو دیووں کی قید سے چھڑا لایا۔ شاہ نامہ میں ہفتخوانِ رستم کے علاوہ ایک اور ہفتخواں بھی ہے، جو ہفتخوانِ اسفندیار کے نام سے موسوم ہے۔ ارجاسپ بادشاہ اسفندیار کی دو بہنوں کو پکڑ کر لے گیا تھا اور اُنہیں روئیں دژ میں، جو ایک قلعہ کا نام ہے، قید کر دیا تھا، جب اسفندیار اپنی بہنوں کو چھڑانے کے لیئے اُس قلعہ کی طرف روانہ ہُوا، تو رستے میں اُسے بھی سات مُصیبت خیز اور ہول ناک واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسفندیار کی بھی ساتوں منزلیں،

جن کو طے کرنے کے بعد وہ اپنی بہنوں کو چھڑا کر لایا، ہفتخوانِ اسفندیار کے نام سے مشہور ہیں۔ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ رستم کے باپ کا نام زال تھا۔ زال کو دستان بھی کہتے ہیں، اِس لحاظ سے رستم کو رستم دستاں کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ زال کی پرورش پہاڑ کے ایک غار میں سیمرغ نے کی تھی۔ جوان ہونے پر سیمرغ نے اپنا ایک پر اُسے دے دیا تھا کہ جب میرے بلانے کی ضرورت ہو، اِس پر کو آگ پر رکھنا میں اُس کی بُو پر آ پہنچوں گا۔ رستم کو جب کبھی کوئی سخت واقعہ پیش آیا، اُسی پر کی مدد سے سیمرغ بلایا گیا اور اُس سے مشورہ کیا گیا۔ سام رستم کے دادا کا نام تھا اور نریماں پردادا کا۔ شغاد رستم کا ایک بھائی تھا، جو اُس کی طرف سے دل میں حسد رکھتا تھا۔ اُس نے سات کنوئیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تیار کرائے اور اُن کو ہتھیاروں سے بھر دیا اور خس پوش کر دیا۔ پھر رستم کو سیر و شکار کے بہانے سے اُس موقع پر لے گیا، جہاں وہ خس پوش کنوئیں تھے۔ رستم جو گھوڑے پر سوار تھا، پہلے کنوئیں میں گر گیا۔ مگر گھوڑے نے جست کی، تو اُس میں سے نکل آیا؛ پھر دوسرے کنوئیں میں جا گرا۔ جب چھ کنوؤں سے جست کر کر نکل چکا اور ساتویں کنوئیں میں گرا، تو رستم اور اُس کا گھوڑا دونوں بہت زخمی ہو گئے تھے۔ آخر رستم نے اِسی کنوئیں میں جان دی۔ شعرا اس واقعہ کی طرف چاہِ رستم کے لفظ سے اشارہ کرتے ہیں۔

چاہِ رستم کی طرح ایک تلمیح چاہِ بیژن بھی ہے۔ بیژن گیو کا بیٹا اور رستم کا بھانجا تھا۔ وہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ پر عاشق ہو گیا تھا۔ اِس کی پاداش میں وہ ایک چاہِ تاریک کے اندر قید کر دیا گیا۔ یہی کنواں چاہِ بیژن کہلاتا ہے۔ رستم اُس کو آخر کار قید سے چھڑا لایا۔

سیاوش کیکاؤس کا بیٹا تھا۔ اپنی سوتیلی ماں کے طعنوں سے تنگ آ کر اپنے باپ کے دشمن افراسیاب کے پاس چلا گیا، جو توران کا بادشاہ تھا۔ وہ پہلے تو اُس کے آنے سے بہت خوش ہوا اور اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی؛ مگر پھر اپنے ایک اور داماد کے بہکانے سکھانے سے اُسے ناحق قتل کر ڈالا۔ خونِ سیاوش اِسی واقعہ کی تلمیح ہے۔ اِس لفظ سے خونِ ناحق مراد لیتے ہیں۔

بہرام گور بھی ایران کا ایک مشہور بادشاہ تھا، جو شہسواری اور نیزہ بازی میں شہرت رکھتا تھا۔ یہ شکار کا بے حد شائق تھا اور اکثر گورخر کا شکار کرتا تھا۔ اِسی لحاظ سے اُسے بہرام گور کا لقب دیا گیا ہے۔ ہمارے شعرا اس بادشاہ کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔

نوشیرواں ایران کا عادل بادشاہ مشہور ہے۔ اُس کا محل ایوانِ کسریٰ کے نام سے موسوم ہے، جو نہایت عالی شان تھا۔ اِسی کو طاقِ کسریٰ بھی کہتے ہیں۔ اِن تلمیحات میں کسریٰ کو نوشیرواں کا مرادف خیال کیجئے۔ جب یہ محل بننے لگا، تو محل کے ایک پہلو پر ایک بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ چاہا کہ اس جھونپڑی کی جگہ خرید لی جائے، تاکہ محل اس گوشے کی طرف ٹیڑھا نہ رہ جائے، مگر بڑھیا نے جگہ دینے سے انکار کیا۔ عاملانِ شاہی نے بڑھیا پر جبر کرنا چاہا، مگر نوشیرواں نے اُنہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا کہ میں ظلم سے رعایا کی زمین پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ اگر میرا محل ٹیڑھا رہے، تو کچھ پروا نہیں۔ عدلِ نوشیروانی کا ذکر جب ہمارے شعرا کرتے ہیں، تو اس بڑھیا کا ذکر ضرور آتا ہے۔

نوشیرواں کا بیٹا ہرمز تھا۔ ہرمز کا بیٹا پرویز، جس کو خسرو پرویز بھی کہتے ہیں۔ اِس بادشاہ ذکر ہمارے شعرا نے بار بار کیا ہے۔ یہ بمقابلہ دیگر شاہانِ ایران کے زیادہ مالدار تھا۔ اِس کے پاس آٹھ خزانے تھے، جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

گنجِ عروس۔ گنجِ بادآورد یا گنجِ شایگاں۔ گنجِ دیبا خسروی۔ گنجِ افراسیاب۔ گنجِ سوختہ۔ گنجِ خضرا
گنجِ شادآورد۔ گنجِ بار۔

اِس بادشاہ کے گھوڑے کا نام شب دیز تھا، جو ایک اعلیٰ درجے کا مشکی گھوڑا تھا۔ کچھ دنوں تو اس بادشاہ نے عاقلانہ اور مدبّرانہ طریقہ سے سلطنت کی، مگر آخر میں وہ عیش پسند ہوگیا۔ اِس نے اپنے محل میں حسین عورتیں کثرت سے جمع کرلیں۔ اِسی زمانۂ عیش میں اُس نے شیریں کے حُسن کا چرچا سُنا۔ یہ آرمن کی ملکہ مہین بانو کی بھتیجی تھی۔ خسرو نے اپنے ایک مصاحب شاپور نامی سے اس باب میں امداد چاہی۔ شاپور کو مصوّری میں کمال تھا۔ اُس نے خسرو کی کئی تصویریں مختلف لباس اور مختلف وضع کی کھینچیں پھر اُن تصویروں کو بغل میں دبا آرمن پہونچا۔ ایک باغ میں، جس میں شیریں سیر و تفریح کے لیے آیا کرتی تھی۔ اُس نے وہ تصویریں درختوں سے لٹکا دیں۔ شیریں کی نظر اُن پر پڑی، تو وہ فریفتہ ہوگئی۔ اُس نے شاپور کو بھی دیکھا اور اُس سے اِن تصویروں کا حال پوچھا۔ اُس نے خسرو کے حُسن و جمال کا تذکرہ اِس طرح نمک مرچ لگا کر کیا کہ وہ خسرو کے پاس جانے اور اُس سے شادی کرنے پر راضی ہوگئی۔ آخرکار شیریں خسرو کے محل میں داخل ہوئی۔ خسرو محل کی تمام حسین عورتوں سے زیادہ اسی سے محبت

کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیریں کو تازہ دودھ سے بہت رغبت تھی۔ شہر کے کنارے ایک پہاڑ کوہِ بیستون نامی کھڑا تھا اُس کی پشت پر بکریوں کے گلّے چرتے تھے۔ اُنہیں کا دُودھ شیریں کے محل میں لایا جاتا تھا، مگر اتنی دُور سے لانے میں دقت تھی۔ ایک نامی سنگ تراش فرہاد سے کہا گیا کہ وہ کوہ مذکور سے ایک نہر کاٹ کر شیریں کے محل تک پہنچا دے تاکہ چراگاہ سے بکریوں کا دُودھ دُوہ کر نہر میں ڈالا جائے اور وہ بہہ کر شیریں کے محل میں پہنچے۔ فرہاد مذکور بھی اتفاق سے شیریں پر فریفتہ تھا۔ اُس کے عشق کے چرچے پھیل چکے تھے۔ خسرو نے اس خیال سے کہ اُس سے پیچھا چھڑائے یہ خدمت اُس کے سپرد کی اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اِس خدمت کو سرانجام دے سکا، تو شیریں اُس کو بخش دی جائیگی۔ خسرو کو یقین تھا کہ فرہاد اِس سنگین خدمت کو انجام تک نہ پہنچا سکیگا؛ مگر عشق اور اُمیدِ وصال محبوب نے فرہاد میں ہزاروں سنگ تراشوں کی قوّت پیدا کردی۔ وہ کمر باندھ کر اس کام میں مشغول ہو گیا۔ بیستون کے پتھر کاٹنے کے وقت فرہاد عشق کی دُھن میں جا بجا شیریں کے مورتیں تراشتا جاتا تھا۔ کئی سال کے بعد جب یہ کام اختتام کے قریب پہنچا اور ایفائے وعدہ کا وقت آیا، تو خسرو نے ایک مکّار بڑھیا کو فرہاد کے پاس بھیجا، جو سر کے بال بکھیرے ہوئے روتی پیٹتی اُس کے پاس پہنچی اور اُس نے یہ جھوٹی خبر سُنائی کہ شیریں کا انتقال ہو گیا۔ فرہاد کو جو صدمہ اس خبر سے ہُوا، وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اُس کے ہاتھ میں تیشہ تھا۔ وہی تیشہ اپنے سر پر دے مارا اور ہلاک ہو گیا۔ شیریں اور فرہاد کا افسانہ ایران میں بچّے بچّے کی زبان پر ہے۔ اس قصے پر مثنویاں لکھی گئیں۔ شاعروں نے لیلیٰ اور مجنوں کی طرح اِن دو عاشق و معشوق کے تذکرہ کو بھی اپنے اشعار میں عاشقانہ شاعری کا محور بنا لیا ہے۔ فرہاد کا لقب کوہکن ہے۔ جوئے شیر وہ نہر ہے، جو فرہاد نے بیستون سے کاٹ کر قصرِ شیریں تک پہنچائی۔ قصرِ شیریں کی جگہ قصرِ خسرو کا لفظ بھی لایا جاتا ہے۔ باربد اس بادشاہ کا خاص درباری بربط نواز تھا، جو موسیقی کے فن میں کمال رکھتا تھا۔ اِس نے تیس راگنیاں ایجاد کیں، جو سی لحن کے نام سے مشہور ہیں۔ ترانۂ باربد یا ترانۂ باربدی سے اِسی بربط نواز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ خسرو پرویز کے تخت کا نام طاقدیس تھا۔ یہ تخت فریدوں سے اُس کے ورثہ میں آیا تھا۔ اِس کا طول (۱۷۰) گز اور عرض (۱۲۰) گز تھا۔ سر سے پاؤں تک جواہر نصب کیے گئے تھے۔ اُس کی چھتری میں بارہ برجوں اور سات ستاروں کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا تھا کہ فلکی اور نجومی حالات اِس سے معلوم ہوتے رہتے تھے۔

مانیؔ اور بہزادؔ دو نقّاشوں کے نام بار بار شاعری میں لائے جاتے ہیں۔ اِن میں سے پہلا ایک دمی نقّاش تھا۔ اُس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا۔ مانوی فرقہ اُسی کی طرف منسوب ہے۔ اُس نے تصویروں کا جو مجموعہ تیار کیا تھا، اُس کو ارتنگؔ یا ارژنگ کہتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ارژنگ ایک دوسرے مصوّر کا نام تھا۔ بہزادؔ شاہ اسمٰعیل صفوی کے زمانے کا نقّاش ہے۔ مرقعِ مانی۔ نقشِ بہزاد کے الفاظ اِنہیں دونوں نقّاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آتش پرستوں یعنی زردشتیوں کے مذہب سے جو تلمیحیں لی گئی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

اہرمنؔ اور یزدانؔ دو قوّتوں کا نام ہے، جو دُنیا پر حکمرانی کرتی ہیں۔ کبھی یہ قوّت غالب آتی ہے اور کبھی وہ۔ اِن میں سے پہلی قوّت بدی کی ہے۔ دوسری قوّت نیکی کی۔ سدہؔ آگ کو کہتے ہیں۔ جمشید نے اوّل اوّل پتھر سے آگ نکلتی دیکھی، تو اس خوشی میں ایک جشن کی بنیاد ڈالی۔ یہ جشن جشنِ سدہ کے نام سے مشہور ہے۔ زردشتی مذہب والے آگ کی پرستش کرتے ہیں۔ آتش کدوں میں آگ ہر وقت روشن رہتی ہے۔ کبھی بُجھنے نہیں پاتی۔ آتشِ فارسی اِسی آگ کی طرف اشارہ ہے۔ آتش کدہ کی خدمت کے لیے جو خوبصورت نوجوان مقرر ہوتے تھے۔ وہ مُغؔ کہلاتے تھے اور اُن کا افسر پیرِ مُغاںؔ کہلاتا تھا۔ یہی نوجوان مجلسوں میں ساقی گری کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آتشکدوں میں ایک جانور چھپکلی کی شکل کا پیدا ہو جاتا ہے، جس کی زندگی کا مدار آگ کھانے پر ہے۔ اس کو سمندرؔ کہتے ہیں۔ سمندر کا ذکر بھی ہماری شاعری میں بار بار آتا ہے۔ جب آفتاب برجِ حمل کے پہلے نقطے پر پہنچتا ہے اور جب کہ ماہ فروردیں کا پہلا دن ہوتا ہے، پارسی خوشیاں مناتے ہیں۔ اِس روز کو نوروزؔ کہتے ہیں۔

نخشبؔ ترکستان کا ایک شہر ہے، جو سمرقند سے تین دن کے رستے پر ہے۔ یہاں ایک حکیم ابنِ عطا نامی نے جسے ابنِ مقنعؔ بھی کہتے ہیں، کسی عجیب طریقے سے ایک مصنوعی چاند بنایا تھا، جو نخشب کے ایک کنوئیں سے ہر روز شام کے وقت برآمد ہوتا تھا اور اتنا بلند ہوتا تھا کہ اُس کی روشنی چاروں طرف بارہ میل تک پہنچتی تھی۔ دو مہینے تک یہ چاند برابر نکلتا رہا۔ اس چاند کو ماہِ نخشب اور ماہِ مقنع کہتے ہیں اور اِس کوئیں کو جس میں سے وہ چاند نکلتا تھا، چاہِ نخشب کہتے ہیں۔ ایک اور تلمیح سنگِ یدہؔ ہے۔ ترکستان میں ایک مقدس پتھر تھا۔ جب بارش کا امساک ہوتا تھا

ترکستان کے لوگ جنگل میں نکل جاتے اور اس پتھر کو ہاتھ پر رکھ کر بارش کی دعا مانگتے تھے۔ اس کی برکت سے بارش ہونے لگتی تھی۔ اس پتھر کو سنگِ یدہ کہتے ہیں۔ کمانِ رستم جب ہماری شاعری میں آتا ہے، تو اس سے قوسِ قزح مراد لی جاتی ہے۔ لسان الغیب حافظ شیراز کا، بلبلِ آمل طالب آملی کا، بلبلِ شیراز سعدی شیرازی کا، حسانِ عجم اور خلاق المعانی خاقانی شروانی کا اور عندلیبِ نیشاپور نظیری نیشاپوری کا لقب ہے۔ شاخِ نبات حافظ شیراز کی محبوبہ کا نام ہے۔ ایاز سلطان محمود غزنوی کا ایک عزیز و محبوب غلام تھا۔ حسن و عشق کے ذکر میں یہ دونوں نام بھی لیئے جاتے ہیں۔ سکندر نے ایران کو فتح کیا تھا۔ شاعروں نے اس کی فتوحات کو آب و تاب سے بیان کیا۔ اس کے عجیب و غریب کارنامے لکھے گئے۔ اس کی تعریف کے گیت یہاں تک گائے گئے کہ لوگوں نے اس کو پیغمبر بھی سمجھ لیا۔ آبِ حیات کے چشمے کی طرف اس کے جانے کا ذکر خضر کی تلمیح میں مذکور ہوا ہے۔ سدِ سکندری کا ذکر ذوالقرنین کی تلمیح میں کیا گیا ہے۔ ایک اور تلمیح سکندر کی نسبت یہ ہے کہ اس نے حکیم بلیناس کی ہدایت سے اسکندریہ میں ایک عظیم الشان مینار بنوایا تھا، جو تین سو گز بلند تھا۔ اس پر ایک آئینہ لگایا تھا، جس کا دور اکیس گز کا اور قطر سات گز کا تھا۔ یہ آئینہ دوربین کا کام دیتا تھا۔ جب اس میں سے دیکھتے تھے، تو قسطنطنیہ کا سارا شہر آنکھوں کے سامنے نظر آتا تھا۔ آئینۂ سکندر سے اسی بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ادبی تلمیحات کے بعد اب ہم ذیل میں عام تلمیحات پر نظر ڈالتے ہیں:۔

عام تلمیحات عام بول چال میں جو تلمیحات مستعمل ہیں، ان میں سے بعض تاریخ سے لی گئی ہیں، بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کے علمِ مذہبی عقائد و اوہام سے ماخوذ ہوئی ہیں۔ بعض ان دونوں قوموں کی خاص خاص رسموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اور بعض کی بنیاد ان فرضی قصوں پر ہے، جو عام طور سے مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض تلمیحیں محاوروں کی شکل میں ہیں اور بعض مثلوں کے پیرایے میں۔ ایسے محاوروں کو ہم تلمیحی محاورے اور ایسی مثالوں کو ہم تلمیحی مثلیں کہتے ہیں۔ ماخذوں کے لحاظ سے یہ تلمیحیں ملی جلی ہیں۔ ہندو مسلمان ان میں برابر کے شریک ہیں۔

مندرجۂ بالا چاروں قسم کے تلمیحات کی مثالیں ہم پیش کرنا چاہتے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:۔

(اوّل) وہ تلمیحیں جو تاریخ سے لی گئی ہیں۔

ڈھائی دن کی بادشاہت یا اڑھائی دن کی بادشاہت سے تھوڑے دنوں کی حکومت یا ناپائدار حکومت مراد ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس واقعہ سے آگاہ ہیں کہ جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھاکر دریا میں کود پڑا، تو نظام سقّے نے اس کو ڈوبتے ڈوبتے بچایا تھا اور اس کے صلے میں اس نے ہمایوں بادشاہ سے ڈھائی دن کی حکومت مانگی تھی۔ نظام نے اس قلیل دورِ حکومت میں چمڑے کا گول روپیہ سونے کی کیل جڑ کر چلایا تھا۔ اس واقعہ سے ایک دوسری تلمیح پیدا ہوئی ہے۔ چام کے دام چلانا۔ اس محاورہ سے جوتے کے زور سے حکومت کرنا اور جبراً کام لینا مراد ہے۔ اورنگ زیبی ایک طبی تلمیح ہے۔ یہ ایک سوداوی مادّہ کا پھوڑا ہے، جو اکثر کئی سال تک ہرا رہتا ہے اور اچھا ہونے میں نہیں آتا۔ جب اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈہ کا محاصرہ کیا اور محاصرہ نے وہ طول کھینچا، تو آب و ہوا کی خرابی سے اکثر اہلِ لشکر کے پھوڑے نکل آئے اور باوجود علاج کے وہ مدّت تک ہرے رہے۔ اسی پھوڑے کو اورنگ زیبی کہتے ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کے زمانے میں بادشاہوں کے جلوس کے ساتھ بائیس اضلاع کی فوج رہتی تھی۔ یہ فوج بائیسی کہلاتی تھی۔ بائیسی ٹوٹنے کا محاورہ اسی سے نکالا گیا ہے، جس سے مراد ہے ساری فوج سے حملہ کرنا، یا تمام زور صرف کرڈالنا۔ ٹوپی والے وہ قزلباش سپاہی کہلاتے ہیں، جو اوّل نادر شاہ کے ساتھ، پھر احمد شاہ ابدالی کے ساتھ آئے تھے۔ ترکی زبان میں قزل کے معنی سُرخ اور باش کے معنی ہیں سر۔ یہ سپاہی سروں پر لال لال ٹوپیاں رکھتے تھے۔ اسی سبب سے قزلباش کہلاتے تھے۔ دلّی والوں نے اِن کا نام ٹوپی والے رکھا۔ ایک زمانے میں دلّی میں افغان بادشاہوں کی حکومت تھی۔ اُس زمانے کی یادگار پٹھانوں کی وہ چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں، جو پاس پاس بنائی گئی ہیں۔ پٹھان تند مزاجی کے سبب کسی کا احسان اپنے سر لینا اور غیر کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا ایک تلمیحی محاورہ ہے، جو اس واقعہ کو یاد دلاتا ہے۔ رادھا کو یاد کرو ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ سری کرشن کی ایک محبوبہ کا نام رادھا اور ایک کا کبجا تھا۔ کبجا بے تکلفی اور شوخی سے یہ کلمہ زبان پر لایا کرتی تھی۔ کالے کلوٹے آدمیوں کو محاورہ میں راون کی سینا کہتے ہیں۔ راون جو لنکا کا راجہ تھا اور جو رام چندر جی کے ساتھ نبرد آزما ہوا، اس کی فوج کے لوگ سیاہ فام تھے، یا اُن کی وردیاں سیاہ رنگ کی تھیں۔ اسی سبب سے رام لیلا میں جو اس واقعہ کی نقل ہے، راون کی فوج کے سپاہیوں کو

سیاہ لباس پہنایا جاتا ہے۔ رستم محاورہ میں بہادر کے معنوں میں بولا جاتا ہے، جیسے بس ایک تم ہی تو رستم ہو۔ یہاں تمہاری رستمی کیوں نہ چلی۔ رستم کا بچہ، رستم خاں اور رستم کا سالا وغیرہ الفاظ بھی بولے جاتے ہیں۔ چھپا رستم ایک اور محاورہ ہے، جس کے دو معنے لیے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ شریر آدمی جو ظاہر میں غریب نظر آتا ہو۔ دوسرے وہ شخص جو کامل الفن ہو اور دقت پر اُس کا ہنر ظاہر ہو۔ افلاطون جو یونان کا مشہور حکیم ہے کشتی کے فن میں کامل تھا۔ اِس بنا پر جہاں زور آور اور زبردست کے معنوں میں رستم کا لفظ بولا جاتا ہے، وہیں افلاطون اور افلاطون کا بچہ وغیرہ الفاظ بھی رائج ہیں۔ سکھا شاہی کے لفظ سے بے انصافی اور کس مپرسی کا زمانہ مراد لیتے ہیں۔ یہ تلمیح سکھوں کے عہدِ حکومت کو یاد دلاتی ہے۔ اِسی طرح نادر شاہی یا نادر گردی سے بدانتظامی اور افراتفری کا زمانہ مراد لیتے ہیں۔ یہ الفاظ نادر شاہ کے زمانے میں اس ملک کی حالت کا پتہ دیتے ہیں۔ تانا شاہی مزاج کا لفظ اُس نازک مزاجی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ابوالحسن تانا شاہ والی گول کنڈہ میں تھی۔ تختِ طاؤس شاہ جہاں کے تخت کی تلمیح ہے، جس پر چھ کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا اور جو جواہرات سے مرصع تھا اور جس کے اوپر ایک مور پنکھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اخفش ایک مشہور صرفی تھا۔ اُس نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ عربی افعال کی گردانیں اُس بکری کے سامنے دہرایا کرتا تھا۔ اگر وہ بکری سر ہلا دیتی، تو سمجھتا تھا کہ سبق یاد ہو گیا؛ ورنہ پھر اُس سبق کو رٹنا شروع کر دیتا تھا۔ جس وقت اِس بکری کو ذبح کیا، تو معلوم ہوا کہ اُس کے سر میں بھیجا نہ رہا۔ اِس سبب سے ایسے آدمی کو جو بے سمجھے گردن ہلا دے، بزِ اخفش کہتے ہیں۔ لکھ بخش یا لکھ داتا اُس شخص کو کہتے ہیں، جو انتہا درجے کا فیاض ہو۔ یہ اصل میں قطب الدین ایبک کا لقب ہے، جو شہاب الدین غوری کا غلام تھا اور اُس کے مرنے پر خود بادشاہ ہو گیا تھا۔ اِس کی فیاضی کی داستانیں آج تک زبان زدِ عام ہیں۔ ہندو آج تک اُسے پوجتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر جا بجا تھان بنا کر اُس کی پوجا کراتے ہیں۔ ہلاکو ظالم اور سفاک آدمی کو کہتے ہیں۔ یہ تلمیح ہولاکو خاں کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو چنگیز خاں کا پوتا تھا اور اِسی نے بغداد کو تاخت و تاراج کیا۔ تورہ والی مغرور عورت کو کہتے ہیں۔ تورہ جتانا شیخی کرنا ہے۔ شرع تورہ بھی محاورہ ہے، جس سے دین داری کا اظہار اور بات بات میں مذہبی روک ٹوک مراد ہے۔ تورہ اصل میں چنگیز خاں کے مجموعہ قوانین کا نام تھا، جس میں ہر قانون کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ یہ سب محاورے اِسی لفظ تورہ سے لیے گئے ہیں۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھاوے یہ ایک تلمیحی مثل ہے۔ راون کے بھائی بھبوشن نے راجہ رام چندر

مل کر اُن کو قلعہ لنکا کے بہت سے بھید بتائے تھے اور اُس کے فتح کرنے میں مدد دی تھی۔ اب اس مثل سے مطلب یہ ہے کہ رازدار کی دشمنی بڑا نقصان پہنچاتی ہے۔

(دُوم) وہ تلمیحیں جو عام عقائد و اوہام سے ماخوذ ہوئی ہیں۔

جب کوئی شخص سفر کو سدھارتا ہے، تو مُسافر کے بازو پر روپیہ وغیرہ باندھ دیا جاتا ہے۔ جب وہ خیر و عافیت سے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے، تو وہ رقم سیدوں کو بانٹ دی جاتی ہے۔ اس کو امام ضامن کا روپیہ کہتے ہیں۔ یہاں امام سے حضرت علی رضا آٹھویں امام مُراد ہیں۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر آپ کے نام کا روپیہ مُسافر کے بازو پر باندھ دیا جائے، تو آپ اُس کی سلامتی کے ضامن ہو جاتے ہیں۔ اندر کا اکھاڑا اُس مقام کو کہتے ہیں، جہاں ناچنے گانے والی حسین عورتیں جمع ہوں۔ ہندو راجہ اندر کو سوارگ پتی یعنی بہشت کا مالک مانتے ہیں، جس کے سامنے حُوریں گاتی اور ناچتی رہتی ہیں۔ یہ محاورہ اِسی خیال پر مبنی ہے۔ بجلی کی تلوار اُس تلوار کو کہتے ہیں جو بہت کاٹ کرنے والی ہو۔ عوام کا خیال ہے کہ بعض مقامات میں بجلی اکثر گرا کرتی ہے۔ وہاں کے لُہار بہت سا لوہا جمع کر کے میدان میں رکھ دیتے ہیں، تاکہ اُس پر بجلی گرے اور وہ آبدار ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ جو تلوار اس لوہے سے بنائی جاتی ہے، اُس کا مقابلہ آبداری اور کاٹ میں کوئی تلوار نہیں کر سکتی۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ جس رستے سے بلّی نکلے اگر کوئی شخص بلّی کے نکل جانے کے بعد اُس رستے سے گزرے، تو اُس کو لڑائی جھگڑا ضرور پیش آتا ہے۔ اِسی سبب سے بلّی آلانگھنا ایک محاورہ ہو گیا ہے، جس کے معنی ہیں لڑنے جھگڑنے کو آنا۔ جو شخص آتے ہی ٹیڑھی ترچھی باتیں کرنے لگے، اُس کی نسبت کہتے ہیں کہ تم بلّی آلانگ کر تو نہیں آئے۔ بھیروں ہندوؤں کے نزدیک شیوجی کا ایک نام ہے اور یہ اُس وقت کے لیئے ہے، جب کہ وہ غضبناک ہوں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اُن کی خفگی سے تباہی اور بربادی آتی ہے۔ اِسی عقیدہ سے بھیروں ناچنا ایک محاورہ بنایا گیا ہے، جس کے معنی ہیں ویرانی چھا جانا۔ جاہل مُسلمان عورتیں بہت سے پیروں، ولیوں اور پریوں کے نام لیتی اور اُن کو مانتی ہیں۔ مثلاً لال پری، سبز پری، زرد پری، سیاہ پری۔ آسمان پری، دریا پری، نور پری، زین خاں، صدر جہاں، ننھے میاں، شاہ دریا، شاہ سکندر، شیخ سدّو ماموں اللہ بخش۔ سید برہنہ، پیر ہتیلے، شاہ مدار، پیر غیب، چالیس تن یا چہل ابدال جن کے دم قدم سے یہ دنیا قائم ہے۔ عورتیں ان پریوں یا ان بزرگوں کی روحوں میں سے کسی رُوح کو اپنے سر پر بُلاتی ہیں۔ جو عورت یہ کام کرتی

ہے، وہ جمعرات کے دن خوشبو زیور اور عمدہ پوشاک سے آراستہ ہو کر بیٹھ جاتی اور گانا سنتی ہے۔ جب کوئی پری یا روح اُس کے سر پر آتی ہے، تو وہ اپنا سر ہلانے لگتی ہے۔ دوسری عورتیں اپنی اپنی حاجتیں اُس کے سامنے پیش کرتی ہیں اور وہ ہر ایک کے سوال کا جواب دیتی جاتی ہے۔ اس طریقہ سے روحوں کے بُلانے کو بیٹھک دینا یا حاضرات کرنا کہتے ہیں۔ اِس تلمیح میں عورتوں کے اِس خاص عقیدے کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر کیا گیا۔ ادنیٰ درجے کے ہندو بھی اِسی طرح کسی دیوی، دیوتا، یا بیر کو اپنے سر پر بُلاتے ہیں۔ اُن میں جو مرد اس کام کو انجام دیتا ہے، اُس کو بھگت کہتے ہیں اور عورت کو بھگتانی۔ بیر اُس جن یا خبیث روح کو کہتے ہیں، جس کو جادوگر کسی کو ضرر پہنچانے کے لئے اِس پر مسلط کرتی ہیں مُسلمان اُس روح کو موکّل کہتے ہیں۔ اِس سے بیر بٹھانا اور بیر دوڑانا دو محاورے پیدا ہوئے ہیں۔ اُڑن کھٹولا اور بِوان یا بِمان کے الفاظ ہندوؤں کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دیوتا ایک تختِ رواں پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے تھے اِس تخت کو ہوا اُڑا کر لے جایا کرتی تھی۔ پاتال ہندی میں زمین کے سب سے نیچے کے طبقے کو کہتے ہیں۔ ہندوؤں نے پاتال کے سات طبقے قرار دیئے ہیں۔ ہر طبقے میں ایک زندہ مخلوق آباد ہے۔ پاتال تک کی خبر لانا اِسی تلمیح سے ایک محاورہ بنایا گیا ہے۔ پارس ایک خیالی پتھر کا نام ہے، جس کی نسبت عام لوگوں میں یہ خیال پھیلا ہُوا ہے کہ اگر یہ پتھر لوہے سے چُھوا جائے، تو اُسے سونا بنا دیتا ہے۔ پچھل پائی کا لفظ جس سے بھُتنی یا چڑیل مُراد ہے، عوام کے اِس خیال کو یاد دلاتا ہے کہ چڑیلوں یا بھتنیوں کے پاؤں میں پنجہ پیچھے کی طرف اور ایڑی آگے کی طرف ہوتی ہے۔ پری ایک خیالی حسین مخلوق ہے، جس کا سارا جسم عورتوں جیسا ہوتا ہے؛ مگر بازو پردار ہوتے ہیں پرستان اُس جگہ کا نام رکھا گیا ہے، جہاں پریاں آباد ہیں۔ پری مادہ اور دیو یا پریزاد نر ہوتے ہیں پرستان یا پریوں کا اکھاڑہ محاورہ میں اُس محفل کو کہتے ہیں، جہاں بہت سے خوب صورت آدمی جمع ہوں۔ بیر کی طرح پَون بھی اُن خبیث روحوں کو کہتے ہیں، جنہیں جادوگر کسی شخص کے ضرر پہنچانے کے لئے بھیجتے ہیں۔ پون بٹھانا اور پون دوڑانا یا چلانا دو محاورے ہیں جو اس لفظ سے بنائے گئے ہیں۔ بُھوت وہ روحیں ہیں، جو جسموں سے جُدا ہو کر دنیا میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مرد کی روح بھوت اور عورت کی روح بھتنی کہلاتی ہے۔ بھوت لوگوں کے سروں پر آتے ہیں۔ یہ عام خیال ہے۔ بھوت چڑھنا کے ساتھ بھوت اُتارنا بھی محاورہ میں آگیا ہے؛ کیونکہ عام خیال یہ بھی ہے کہ منتر کے زور سے بھوت کسی کے سر سے اُتارا بھی جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک سات سمندر سے مراد بحیرۂ شام، بحیرۂ قلزم،

بحرِ عرب، بحیرۂ عمان، بحیرۂ فارس اور بحرِ اسود ہیں؛ مگر ہندوؤں کے سات سمندروں میں سے ایک سمندر نمک کا ہے، دوسرا دودھ کا، تیسرا گھی کا، چوتھا دہی کا، پانچواں شراب کا، چھٹا گنّے کے رس کا اور ساتواں شہد کا ہے۔ سفلی عمل جادو کی وہ قسم ہے، جو شیاطین و جنّات کی مدد سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ برخلاف اِس کے علوی عمل وہ ہے، جس میں ستاروں اور فرشتوں سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ جادو کی نسبت عام لوگوں کا جو عقیدہ ہے، اُس کو یہ دونوں الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ خدا کے اسما دو قسم کے مانے جاتے ہیں۔ ایک جلالی جن سے غصّہ اور جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے جمالی جن سے رحم و لطف نمایاں ہے۔ جب خدا کا کوئی جلالی اِسم ننگی تلوار کی پشت پر پڑھ کر پھونکتے ہیں، تو اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن ہلاک ہو۔ اِس عمل کو سیفی کہتے ہیں۔ اگر اسم مذکور کے پڑھنے میں بے احتیاطی ہو، تو کہتے ہیں کہ یہ عمل اُلٹا عامل کے لیئے تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ اِس حالت کو سیفی کا اُلٹ جانا کہتے ہیں۔ سانپ کا من عوام کے اِس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ جب سانپ خوش ہوتا ہے، تو وہ ایک روشن جواہر منھ سے باہر نکال کر جنگل میں رکھ دیتا ہے۔ اُس کی روشنی چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوتی ہے۔ سانپ اِس روشنی میں کوسوں سیر کرتا پھرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس کسی کے پاس سانپ کا من ہو، وہ تمام آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ نہ آگ اُسے جلا سکتی ہے، نہ پانی اُسے ڈبو سکتا ہے۔ شب چراغ بھی ایسا ہی لفظ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک جواہر ہے۔ دریائی گائے رات کے وقت چرنے نکلتی ہے، تو اِس جواہر کو منھ سے نکال کر رکھ دیتی ہے اور اُس کی روشنی میں چرتی پھرتی ہے۔ چرنے چکنے کے بعد اُس کو اپنے منھ میں رکھ کر دریا میں غوطے لگا جاتی ہے۔ شبِ برات میں لفظ برات کے معنی روزی کے ہیں۔ اِس لفظ سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ اِس رات کو یعنی شعبان کی چودھویں یا پندرھویں رات کو فرشتے انسانوں کی روزی اور عمر کا حساب آیندہ کے لیئے لگاتے اور روزی تقسیم کرتے ہیں۔ ست جُگ ہندوؤں کے نزدیک دنیا کا پہلا دور ہے، جس میں سچ اور راستی کے سوا دوسری بات کا نام نہ تھا۔ اِس دَور کی میعاد سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار برس قرار دی گئی ہے۔ اِس کے مقابل ایک دَور کلجگ کہلاتا ہے۔ یہ دَور چار لاکھ بتیس ہزار برس کا ٹھہرایا گیا ہے۔ اِس زمانے میں پاپ اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ تریتا جُگ اور دواپر جُگ دو اور جُگ ہیں؛ مگر عام لوگوں میں مشہور یہی جُگ ہیں۔ لچھمی ہندوؤں کے اعتقاد میں دولت کی دیوی ہے۔ لچھمی گھر میں آنا ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں حسبِ منشا اقبال ہونا۔ لنکا میں جو چھوٹا سو باون ہی گز کا۔ یا لنکا سے جو نکلا سو باون گز کا۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہے۔ اُس موقع پر بولی جاتی

ہے، جہاں چھوٹے بڑے سب شریر اور فتنہ پرداز ہوں۔ ہندؤں کا عقیدہ ہے کہ جزیرہ لنکا میں دیو رہتے تھے، جو بہت بڑے بڑے قد کے ہوتے تھے، یہاں تک کہ اُن کے بچے بھی باون گز سے کم قد نہیں رکھتے تھے اور اُن کا مزاج نہایت سرکش اور شریر واقع ہوا تھا۔ میر بھجڑی کی کڑھائی۔ ایک تلمیح ہے، جو ہیجڑوں سے لی گئی ہے۔ میر بھجڑی جسے میر بھوجی بھی کہتے ہیں، ہیجڑوں کے سلسلے کا بانی تھا۔ ہیجڑے اُس کی نیاز دلواتے ہیں۔ اُن کا یقین ہے کہ اگر کوئی اس نیاز کی کڑھائی کا حلوا کھالے، تو وہ ناچنے تھرکنے اور ہیجڑوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور جب تک ہیجڑا نہ بن جائے اُسے کل نہیں پڑتی۔ یوہا یا یوحی عوام کے خیال میں ایک قسم کا سانپ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس گزرنے پر وہ ایک آواز نکالتا ہے اور خاموش ہوجاتا ہے۔ پھر ہزار برس کے بعد ایک دفعہ چلاتا اور چپ ہوجاتا ہے۔ تیسری دفعہ یعنی تین ہزار برس کے بعد یہ قدرت اُسے حاصل ہوجاتی ہے کہ جس شکل اور جس روپ کا چاہے، بن جائے۔ یعنی انسان یا حیوان بننے کی طاقت اُسے حاصل ہوجاتی ہے۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک جن پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کو ہمزاد کہتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو خاص عمل کے ذریعے سے اُس کو قابو میں لاسکتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق اُس سے کام لے سکتے ہیں۔ ہندؤں کے خیال میں ایک فرضی وجود ہے، جو دکھائی نہیں دیتا اور دنیا کے گرد حرکت کرتا رہتا ہے۔ کبھی کسی طرف ہوتا ہے۔ کبھی کسی طرف مثلاً شنبہ کے دن وہ مشرق میں ہوتا ہے۔ پنجشنبہ کے دن جنوب میں، منگل کے دن شمال میں۔ اتوار کے دن مغرب میں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اِس فرضی وجود کا نام ہندؤں نے دساسول رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس روز وہ جس سمت میں ہو، اُس روز اُس سمت میں سفر کرنا نقصان اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ سفر کرنے والے پر واجب ہے کہ دساسول کو بائیں طرف یا اپنی پشت کی طرف رکھے۔ اُس کا سامنے پڑنا یا دائیں ہاتھ پر ہونا از حد منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ الوپ انجن ایک قسم کا سرمہ ہے، جس کے لگانے سے آدمی آپ تو سب کو دیکھتا ہے؛ مگر اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اِسے سرمۂ سلیمان بھی کہتے ہیں۔ گٹکا پارہ کی ایک طلسمی گولی ہے، جسے جوگی تیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِس گولی کو منہ میں رکھنے سے قوّت پرواز آجاتی ہے اور اِس کی مدد سے جوگی جہاں چاہتے ہیں اُڑ کر چلے جاتے جاتے ہیں۔

(سوم) وہ تلمیحیں جو خاص خاص رسموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

مُسلمان عورتوں میں دستور ہے کہ نکاح کے بعد دولہا دولہن کو آمنے سامنے سر سے سر ملا کر اور ایک سُرخ دوپٹہ اُڑھا کر
بٹھا دیتی ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں ایک آئینہ اور قرآن شریف میں سے سورۂ اخلاص نکال کر رکھ دیتی ہیں۔
اس رسم کو آرسی مصحف کہتے ہیں۔ آرسی سے مُراد آئینہ ہے۔ آئینہ رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ دولہا دولہن ایک دوسرے
کا چہرہ دیکھ لیں۔ سورۂ اخلاص سے غرض یہ ہے کہ میاں بیوی میں ہمیشہ اخلاص بنا رہے۔ دیو اُٹھان ہندوؤں کی
ایک رسم ہے، جو کاتک سدی اکادشی کو منائی جاتی ہے۔ وشنو ہندوؤں کے نزدیک چار مہینے سے اس تاریخ تک
سوتے رہتے ہیں۔ ہندو اس تاریخ کو ایک معیّن جگہ لیپ پوت کر گھریا اور گیرو سے اُس پر نقش ونگار بناتے ہیں
اور وہاں پوجا کی چیزیں رکھ کر اُن کو ایک تھالی سے ڈھک دیتے ہیں۔ گھر کی کوئی عورت یا کوئی برہمنی ہاتھوں
سے اس تھالی کو بجاتی جاتی اور یہ کہہ کر "اُٹھو دیو اُٹھو" وشنو کی تعریف کے فقرے گاتی جاتی ہے۔ سوئمبر ہندوؤں
کی ایک قدیم رسم کا نام ہے۔ جب راجاؤں یا عالی خاندان کے لوگوں میں کسی لڑکی کے لیے بر درکار ہوتا تھا،
تو تمام راجاؤں اور امیروں کو پہلے سے اطلاع دی جاتی تھی۔ تاریخ معیّن پر سب جمع ہو جاتے تھے۔ لڑکی
بھرے جلسے میں آکر شہزادوں اور امیرزادوں کے کرتب دیکھتی تھی اور ان میں سے جس کو اپنا شوہر بنانا
پسند کرتی تھی، اُس کے گلے میں اپنے ہاتھ سے پھولوں کا ہار ڈال دیتی تھی۔ دہیوں کا کونڈا مسلمان عورتوں
کی ایک رسم کی تلمیح ہے۔ جب کسی لڑکے کی مسیں بھیگتی ہیں، تو اس خوشی میں اُس کی ماں حضرت خاتونِ جنت
کی نیاز دلواتی ہے اور اُس میں رشتہ دار جمع کیے جاتے ہیں۔ آمین ایک رسم ہے جو قرآن کے ختم ہونے یا
اُس کا کوئی حصّہ ختم ہونے پر ادا کی جاتی ہے۔ لڑکا جب مکتب میں قرآن کی تعلیم پاتا ہے، اُس کے تمام شاگرد
اور اُستاد اُس لڑکے کے مکان پر پہنچ کر ایک خاص نظم بہ آوازِ بلند پڑھتے ہیں۔ ایک لڑکا پڑھتا ہے۔ باقی سب
لڑکے ہر شعر پر پکار کر آمین کہتے جاتے ہیں۔ نظم پڑھنے کے بعد دعا مانگی جاتی ہے۔ شیرینی تقسیم ہوتی ہے اور اُستاد
کو لڑکے کے ماں باپ حسبِ توفیق نذر دیتے ہیں۔ رت جگا ایک اور رسم ہے، جو بیاہ، سال گرہ، بسم اللہ یا
کسی اور تقریب پر منائی جاتی ہے۔ اس موقع پر عورتیں جمع ہوتی ہیں اور رات بھر جاگتی ہیں۔ رات کو کڑھائی
ہو کر دن کو گلگلوں اور رسم پر اوّل اللہ میاں کی سلامتی پڑھی جاتی۔ پھر زردے یا خشکہ پر حضرت فاطمہ
کی نیاز دلوائی جاتی ہے۔ مُسلمان عورتوں میں شادی کے وقت کی ایک خاص رسم ہے، جسے نوبا میں جنوانا

کہتے ہیں۔ نوبات، نبات سے بگڑا ہے جس کے معنی ہیں مصری کی نوڈلیاں دُلھن کے دونوں مونڈھوں، گھٹنوں، پیٹھ اور ہاتھوں پر رکھی جاتی ہیں۔ دولھا سے کہا جاتا ہے کہ ان ڈلیوں کو ایک ایک کرکے موتھ سے اُٹھاؤ اور ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہ حقیقت میں ایک ٹوٹکا ہے، جس سے غرض یہ ہے کہ دولھا ہمیشہ دُلھن کا فرماں بردار رہے۔ تارے دکھانا اور رسم ہے، جو ایّام زچگی میں ادا کی جاتی ہے۔ زچّہ کو رات کے وقت چھٹی کے روز دالان سے باہر لاکر تارے دکھاتی ہیں دو عورتوں کے ہاتھ میں تلواریں ہوتی ہیں اور وہ اُس کے ساتھ محافظ بن کر آتی ہیں۔ زچّہ بچّے کو گود میں لے۔ قرآن شریف کو سر پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتی اور سات تارے گنتی ہے عورتوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے زچّہ کو جن دپری کا خوف نہیں رہتا۔ بیوی کی صحنک ایک اور رسم ہے۔ اکثر شادی یا کسی مراد کے بر آنے پر عورتیں حضرت فاطمہ کے نیاز دلواتی ہیں۔ اِس میں بڑی احتیاط کی جاتی ہے۔ سہاگن اور پارسا عورتیں شامل ہوتی ہیں اگر کوئی عورت دوخاوند کر چکی ہو، تو اُس کو شریک نہیں کرتیں، بلکہ سیدانیوں کو اس نیاز کا کھانا کھلانا اولیٰ سمجھتی ہیں جہانگیر کے زمانے سے یہ رسم جاری ہوئی ہے۔ پھول ہونا ایک اور رسم ہے، جو مرنے سے تیسرے دن ادا کی جاتی ہے۔ ہندؤں میں دستور ہے کہ مرنے سے تیسرے دن مُردے کی ہڈیاں، جنھیں وہ پھول کہتے ہیں، چُنی جاتی اور دریائے گنگا میں بہائی جاتی ہیں۔ مُسلمانوں میں بھی تیسرے دن مردے کی فاتحہ ہوتی ہے۔ چنوں کے دانوں پر کلمہ پڑھا جاتا ہے، تاکہ مردے کی روح کو ثواب پہنچایا جائے۔ فاتحہ کے وقت کچھ ارگجا اور کچھ پھول لائے جاتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ پڑھ کر ہر ایک حاضر مجلس ارگجے کے پیالے میں پھول ڈالتا ہے اور یہ پھول اور خوشبو مردے کی قبر پر بھیجی جاتی ہے۔ اِن کے علاوہ اور بھی رسمیں ہیں مثلاً بسم اللہ، چھٹی، چوتھی، منگنی، ستوانسا، مہندی، بری، یا ساچق، چالیسواں وغیرہ۔

(چہارم) وہ تلمیحیں جن کی بنیاد فرضی قصّوں پر ہے۔

عتربود کرنا ایک محاورہ ہے، جسے عام آدمی بولتے ہیں۔ اِس کے معنی ہیں مطلب خبط کرنا۔ اِس کا قصہ اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک بے وقوف آدمی بوستان پڑھتا تھا۔ جب سعدیؒ کے اِس شعر پر پہنچا ؎

کہ سعدی کہ گوئے بلاغت ربود

در ایّام بوبکر بن سعد بود

تو اُس نے استاد سے پوچھا:- عنتر بود کے کیا معنی ہیں۔ بلاغت میں سے اُس نے بلا کو جدا کرکے دوسرے لفظ ربود سے ملا دیا اور عنتر بود کو ایک لفظ سمجھا۔ ٹیڑھی کھیر کے معنی ہیں مشکل کام۔ کہتے ہیں کہ ایک اندھے سے کسی شخص نے پوچھا۔ حافظ جی! کھیر کھاؤ گے، اُس نے کہا، کھیر کیسی ہوتی ہے۔ اِس نے کہا سفید، پوچھا سفید کیسی، کہا جیسے بگلا۔ اُس نے پوچھا، بگلا کیسا ہوتا ہے۔ اِس نے ہاتھ ٹیڑھا کرکے دکھایا کہ ایسا۔ اندھے نے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے ٹٹول کر کہا۔ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم سے نہیں کھائی جائیگی۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی زمیندار کے ہاں بھینس کی چوری کی تھی۔ قاضی نے تمام مشتبہ آدمیوں کو، جن میں چور بھی تھا، سامنے کھڑا کر دیا، پھر اپنے ایک پیادے سے کہا۔ میں جس کی طرف اشارہ کروں، تم اُسے گرفتار کر لینا۔ پھر اُس نے کہا۔ دیکھ چور کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔ چور کے دل میں ڈبکا تھا ہی۔ اُس نے فوراً اپنی داڑھی پر ہاتھ ڈالا اور اِس حرکت سے وہ شناخت کرکے پکڑا گیا۔ نیبو نچوڑ، ناخواندہ مہمان کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک سرائے میں ایک مفت خورہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس کا دستور تھا کہ جب کوئی مسافر کھانا کھانے بیٹھتا، تو ایک نیبو لے کر دسترخوان پر پہنچ جاتا۔ مسافر کے آگے سالن دیکھ کر کہتا ہے کہ حضرت نیبو اس کا بناؤ ہے۔ ذرا اس کو نچوڑ کر مزا دیکھئے۔ وہ بیچارہ مروت میں آکر اُس کو بھی کھانے میں شریک کر لیتا۔ طفیلی کا لفظ بھی اِسی طرح پیدا ہوا ہے۔ طفیل کوفہ کا ایک شاعر تھا۔ اِس کی عادت تھی کہ جب لوگوں کو کسی دعوت میں جاتے دیکھتا تو یہ بھی اُن کے ساتھ ہو لیتا تھا اور بے تکلف دعوت میں شریک ہو جاتا تھا۔ ناؤ میں خاک اُڑانا ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں جھوٹا الزام لگانا۔ کہتے ہیں کہ ایک شیر اور ایک بکری دونوں کشتی میں سوار تھے۔ شیر نے اُس کو کھانے کی نیت سے کہا کہ تو کشتی میں کیوں خاک اُڑاتی ہے۔ اُس نے کہا۔ جناب یہاں خاک کہاں ہے، جسے میں اُڑاؤں۔ شیر نے غصے میں آکر کہا۔ تو ہماری بات کو جھٹلاتی ہے۔ دیکھ تو میں تیری گستاخی کا کیا مزا چکھاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس پر حملہ کیا اور پھاڑ چیر کر اُسے کھا گیا۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال

اس کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ بے دریغ نیکی کر۔ اِس بات کی پروا نہ کر کہ اس کا انعام بھی کچھ

کے قصے میں لکھا ہے کہ ایک شخص دریا میں ہر روز دو روٹیاں ڈالا کرتا تھا۔ خدا۔

کی۔ اِس کا مفصل قصہ حاتم طائی کے قصے میں دیکھنا چاہیئے۔ اود بلاؤ کی

نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ جب کئی اود بلاؤ مل کر مچھلیاں مارتے ہیں، تو دریا

کا حصہ الگ الگ لگاتے ہیں۔ مگر کوئی نہ کوئی اودبلاؤ اپنے حصے کو کم سمجھ کر سارے حصوں کو گڈمڈ کر دیتا ہی۔ پھر از سر نو حصے لگائے جاتے ہیں اور اس تقسیم کا انجام بھی یہی ہوتا ہی۔ غرض کہ اُن میں برابر جھگڑا ہوتا رہتا ہی اور کسی طرح فیصلہ ہونے میں نہیں آتا۔ نمازی کا ٹکا اُس ناشائستہ بات کو کہتے ہیں، جس کا بدلا کہیں نہ کہیں ضرور مل کر رہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شریر لڑکا نماز پڑھتے میں لوگوں کی ٹانگیں گھسیٹ لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب سجدہ کرتے وقت اُس نے کسی نمازی کی ٹانگ گھسیٹی، تو اُس نے ملامت کرنے کی بجائے سلام پھیر چکنے سے ایک ٹکا اُس کے حوالے کیا۔ تاکہ یہ مزا پڑ جائے، تو وہ کہیں نہ کہیں اِس کی سزا پائے۔ اُسے تو ٹکے کی چاٹ لگ ہی گئی تھی، اتفاق سے ایک جلّاد پٹھان کے ساتھ بھی اُس نے یہی حرکت کی۔ اُس نے سلام پھیرتے ہی تلوار میان سے نکالی اور اُس شریر لڑکے کی گردن اُڑا دی۔ آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں اس فقرہ کا مطلب یہ ہی کہ بہت سا کام ہو چکا ہی۔ تھوڑا سا باقی رہ گیا ہی۔ کہتے ہیں۔ ایک سوداگر بچے کی دوستی کسی جادوگرنی سے تھی۔ وہ اُس کی بیوی کے نام سے جلا کرتی تھی۔ ایک روز اُس نے جادو کی ایک پڑیا سوداگر بچے کے گھر میں پھکوائی۔ اتفاق سے وہ پڑیا بجائے اِس کے کہ اُس کی نیکبخت بیوی کو کچھ ضرر پہنچائے، خود سوداگر بچے کے بدن پر جا پڑی۔ اُس کا پڑنا تھا کہ اُس کے سارے تن بدن میں سوئیاں ہی سوئیاں چُبھ گئیں۔ سوداگر بچہ اس تکلیف کے مارے بیہوش ہو گیا۔ بیوی نے صبح کی نماز پڑھ کر میاں کی یہ حالت دیکھی، تو وہ فوراً سوئیاں نکالنے میں مشغول ہو گئی۔ ہاتھ سے سوئیاں نکالنے میں تکلیف ہونے لگی، تو اُس نے ہونٹوں سے نکالنی شروع کیں، تھوڑی سی سوئیاں نکالنی باقی تھیں کہ ظہر کا وقت آگیا۔ اُس نے باندی سے کہا کہ میں ظہر کی نماز پڑھتی ہوں۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہی۔ اب میری جگہ تو کام کر۔ باندی سوئیاں نکالنے لگی، بیوی ظہر کی نماز سے فارغ نہیں ہوئی تھی کہ سوئیاں سب نکال لی گئیں۔ سوداگر بچہ کو ہوش آگیا۔ اُس نے آنکھ کھول کر دیکھا، تو بیوی اُس کے پاس نہ تھی۔ باندی اُس کی خدمت کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس کو بیوی سے نفرت ہو گئی۔ اُس [illegible] ی کو بیوی بنا لیا اور بیوی کو باندی کی خدمت پر مامور کر دیا۔ بھیگی بلی بتانا ایک تلمیحی محاورہ ہی، جس کے [illegible] سامنے کرنا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مکان کے دالان میں شب کے وقت پڑے رہنے والے [illegible] بھی ایک طرف پڑا تھا۔ نوکر کو اُس کے آقا نے کئی دفعہ کام کے لیئے دالان سے [illegible] کر بہانہ کر دیتا تھا، تاکہ اُسے باہر نہ جانا پڑے۔ آخر میں آقا نے کہا۔ باہر اگن

میں بارش ہو رہی تھی - ذرا باہر جا کر تو دیکھ اب بارش تھم گئی ہے یا ہو رہی ہے۔ نوکر نے جواب دیا کہ ابھی بارش ہو رہی ہے۔ آقا نے پوچھا۔ تو نے کس طرح معلوم کیا۔ اُس نے کہا۔ باہر سے بلی اندر آئی تھی میں نے اُس پر ہاتھ پھیر کر دیکھا، تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔ جون پور کا قاضی محاورہ میں احمق آدمی کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شہر کے کسی مکتب میں اُس مکتب کا اُستاد اپنے ایک شاگرد پر خفا ہو رہا تھا۔ اثنائے خفگی میں اُس نے کہا۔ نالائق! تو میرا احسان نہیں مانتا کہ میں نے تجھے گدھے سے آدمی بنایا۔ ایک کمہار نے جو اُس مکتب کے قریب گزر رہا تھا، یہ بات سُنی۔ فوراً مکتب میں آیا اور اُس نے اُستاد سے کہا کہ میرے پاس بھی ایک گدھا ہے۔ اگر آپ اُسے آدمی بنا دیں، تو بڑا احسان ہو۔ اُستاد اُس کی حماقت کو تاڑ گیا۔ اُس نے ہنسی کے طور پر کہا۔ اگر تم سو روپیہ دو اور اپنا گدھا میرے پاس چھوڑ جاؤ، تو سال بھر کے بعد میں اُس کو آدمی بنا دوں گا۔ کمہار اس شرط پر راضی ہو گیا۔ گدھا اُستاد صاحب کے پاس چھوڑ گیا اور سو روپیہ بھی دے گیا۔ سال بھر کے بعد آیا، تو اُستاد اُس گدھے کو فروخت کر کے دام کھرے کر چکے تھے۔ اُس نے کہا۔ میرا گدھا جسے آپ نے آدمی بنا دیا ہوگا، واپس کیجئے۔ اُستاد صاحب نے کہا۔ میں نے اُس کو آدمی ہی نہیں بنایا، بلکہ لکھا پڑھا کر عالم بھی بنا دیا ہے۔ اب وہ جونپور میں قاضی کے عہدہ پر مامور ہے۔ یہ سُن کر کمہار خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ فوراً چھوئی، پلانا ہمراہ لے جون پور کو روانہ ہُوا۔ قاضی صاحب عدالت کر رہے تھے۔ کوئی مقدمہ اُن کے سامنے پیش ہو رہا تھا۔ کمہار اُن کے سامنے ذرا دُور کھڑا ہو گیا اور قاضی صاحب کو چھوئی پلانا دکھانے لگا، تاکہ وہ اپنے مالک کو پہچان لیں اور اُس کے پاس چلے آئیں۔ قاضی نے یہ عجیب حرکت دیکھی، تو آدمی بھیج کر اِس حرکت کا سبب دریافت کیا۔ کمہار نے سارا ماجرا اوّل سے آخر تک کہہ سُنایا۔ جب قاضی صاحب کو یہ حال معلوم ہُوا، تو اِس خیال سے کہ لوگوں میں اُن کی ہنسی نہ اُڑے، اُس کو ایک معقول رقم دے کر ٹالا اور اُس سے خدا خدا کر کے پیچھا چھڑایا۔ شیخ چلّی ایسے شخص کو کہتے ہیں، جو دُور دراز کار منصوبے باندھے۔ یہ ایک فرضی شخص لوگوں نے گڑھ لیا ہے اور اِس قسم کی تمام باتیں جو دور از کار منصوبوں اور تجویزوں سے تعلق رکھتی ہیں، اُس کے نام کے ساتھ چپکا دی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ شیخ جی کو ایک شخص نے مزدوری پر لگایا۔ ایک ٹوکری میں شیشہ آلات بھر کر اُن کو دیے کہ فلاں جگہ اس ٹوکرے کو پہنچا دو۔ شیخ جی نے رستے میں ایک جگہ ٹوکرے کو الگ رکھ کر سوچنا شروع کیا کہ آج جو مزدوری مجھے وصول ہو گی، اُس سے ایک مرغا اور ایک مرغی خرید کروں گا۔ مرغی کو انڈے دینے

بٹھاؤنگا۔ اُس سے بہت سے بچے حاصل ہونگے۔ جب بہت سی مرغیاں ہو جائینگی، تو اُن کو بیچ کر ایک بکری اور ایک بکرا خرید کرونگا اور اُس کی نسل بڑھاؤنگا۔ بکریوں کا گلہ جب بڑھ جائیگا، تو اُس کو فروخت کر کے گائے لونگا۔ گائے کی نسل اسی طرح ترقی کریگی۔ گایوں کا گلہ بیچ کر بھینسیں لونگا۔ جب بہت سی بھینسیں ہو جائینگی، تو اُن کی تجارت سے میں امیر و کبیر ہو جاؤنگا۔ ایک بڑے گھرانے میں شادی کرونگا۔ بیوی ایسی تلاش کرونگا، جو حسین ہو۔ میں اُس کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھونگا۔ اگر وہ نافرمانی کریگی، تو میں اُس کی کمر پر زور سے ایک لات جڑونگا۔ شیخ جی اس وقت غصے میں تھے۔ خیالی بیوی کی جگہ آپ کی لات ٹوکرے پر پڑی اور تمام شیشے چور چور ہوگئے۔

لال بجھکڑ اُس شخص کو کہتے ہیں، جو ہر بات کا جواب دینے اور ہر معاملہ میں رائے دینے پر تیار رہتا ہو۔ اصل میں تو احمق ہو؛ مگر اپنے تئیں سب سے زیادہ عقلمند خیال کرتا ہو۔ شیخ چلی کی طرح لال بجھکڑ بھی لوگوں نے ایک فرضی شخص تراش لیا ہے اور اس قسم کی تمام رائیں جو حماقت پر مبنی ہوں، اُس کی طرف منسوب کردی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جس گاؤں میں لال بجھکڑ رہتا تھا، اُس کے رہنے والوں نے ہاتھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ ایک ہاتھی اِس گاؤں سے گزرا۔ اُس کے پاؤں کے نشان زمین پر پڑے۔ گاؤں والوں نے ہاتھی کو تو نہیں دیکھا۔ اُس کے پاؤں کے نشان ضرور دیکھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ نشان زمین پر کیونکر ہو گئے۔ لال بجھکڑ کو وہ نشان لا کر دکھائے اور اُن کی حقیقت دریافت کی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ارے بے وقوفو! میرے سوا کوئی اس معمّے کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہرن چکی کے پاٹ چاروں پاؤں سے باندھ کر کودا ہے اور اس سے یہ نشان زمین پر بنے ہیں۔ اِسی طرح ایک دفعہ ایک لڑکا گھر کے ایک ستون کو ہاتھوں کے حلقے میں لیئے کھڑا تھا۔ اِس اثنا میں اُس کا باپ باہر سے چنے چباتا آیا۔ لڑکے نے اِسی حالت میں اُس سے چنے مانگے۔ باپ نے اُس کی مٹھی میں چنے دیدیئے؛ مگر اب یہ مشکل پیش آئی کہ ستون سے ہاتھ کیوں کر نکالے۔ اگر ہاتھ جدا کرے، تو چنے زمین پر گرینگے اور یہ اُسے منظور نہ تھا۔ لڑکا رونے لگا۔ باپ کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی۔ وہ دوڑا دوڑا لال بجھکڑ کے پاس پہونچا اور اُس کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اُس نے موچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ بھلا میرے سوا کون اس تدبیر کو بتا سکتا ہے۔ جاؤ۔ گھر کی چھت کو اُدھیڑ ڈالو۔ جب ستون پر سے چھت ہٹ جائیگی تو لڑکے کو آسانی سے تم چھت پر کھینچ لوگے۔ مٹھی سے چنے بھی گرنے نہ پائینگے اور لڑکا بھی صحیح سلامت ستون سے نکل آئیگا۔ یک نہ شد دو شد۔ ایک تلمیحی مثل ہے۔ یہ اُس موقع پر بولی جاتی

ہے، جب کہ ایک عجیب امر کے بعد دوسرا عجیب امر واقع ہو۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو ایک ایسا منتر معلوم تھا کہ اُس کے
ذریعہ سے وہ مُردے کو جگا سکتا اور اُس سے باتیں کر سکتا تھا۔ دوسرا ایک اور منتر بھی معلوم تھا، کہ جس کے ذریعے سے
وہ مُردے کو باتیں کرنے کے بعد پھر قبر میں سلا دیتا تھا۔ اگر کسی مُردہ کے گھر والوں کو راز کی کچھ باتیں مُردہ سے پوچھنی ہوتیں،
تو اُس عامل سے جا کر التجا کرتے تھے۔ وہ اپنے عمل سے مُردہ کو جگا کر سب کچھ پوچھ دیتا، پھر اُس کو دوبارہ سلا دیتا تھا۔ مرتے
وقت اُس نے ایک شاگرد کو وہ دونوں منتر بتائے۔ شاگرد نے بطور آزمائش کے ایک قبر پر پہلا منتر پڑھا۔ مُردہ جاگ
اُٹھا اور اُس سے باتیں کرنے لگا اور اُس نے ہر سوال کا جواب دیا؛ مگر دوسرا منتر اتفاق سے یاد نہیں رہا۔ اس کا
نتیجہ یہ ہُوا کہ مُردہ اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اُس نے گھبرا کر اُستاد کو قبر سے اُٹھایا، تاکہ وہ پہلے منتر کا اُتار دوبارہ بتائے؛
مگر اُس عالم میں وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ پہلے مُردہ کی طرح یہ نیا مُردہ بھی اب اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اِس موقع پر بے ساختہ
اُس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا۔ اِس مثل کی طرح ایک اور فارسی تلمیحی مثل اُردو میں مستعمل ہے۔ گربہ کشتن روزِ اول۔ اِس
مثل کا مطلب یہ ہے کہ رعب پہلے ہی دن جمانا چاہیئے۔ کہتے ہیں، دو دوستوں نے ایک ساتھ شادی کی۔ دونوں
کی بیویاں بد مزاج نکلیں۔ ایک کی بیوی خاوند پر غالب آئی۔ دوسرے کی نہایت فرماں بردار ثابت ہوئی۔ پہلے دوست
نے دوسرے سے دریافت کیا کہ تم نے اپنی بد مزاج بیوی کو کس طرح مطیع کیا۔ اُس نے کہا۔ اوّل ہی روز جب ہم میاں
بیوی کھانے پر بیٹھے، تو ایک بلّی بھی دسترخوان پر آ بیٹھی۔ میں نے کہا۔ چل جا، وہ نہ گئی۔ تب میں نے فوراً اُٹھ کر اُسے
مار ڈالا۔ اِس واقعے سے میری بیوی پر میرا رُعب چھا گیا۔ وہ ڈرنے لگی کہ جس نے ذرا سی بات نہ ماننے پر بلّی کو مار ڈالا،
وہ خدا جانے میرا کیا حال کرے گا۔ یہ سُن کر دوست نے بھی اِس پر عمل کیا؛ مگر چونکہ اُس کی بیوی اُس کی عادت سے واقف
ہو چکی تھی اور اُس کے مزاج پر غالب آ چکی تھی؛ اِس لیئے کچھ پیش نہ گئی۔ اِس کا حال معلوم کر کے دوست نے کہا۔
بھائی گربہ کشتن روزِ اول بعد کا رُعب جمانا کام نہیں دیتا۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی۔ یہ بھی ایک تلمیحی مثل
ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امیر غریب کی نسبت نہیں؛ مگر تقدیر کے نزدیک کوئی بات عجیب نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب راجہ بھوج پر مصیبت
پڑی اور راج پاٹ چھن گیا، تو وہ مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک دفعہ مانگتا کھاتا ایک رانی کے پاس جا نکلا۔ ابھی وہ محل ہی
میں تھا کہ ایک کاٹ کی مورتی رانی کا کھونٹی پر لٹکا ہُوا ہار نگل گئی۔ رانی نے بھوج کو چور سمجھ کر راجہ کے پاس بھیج دیا۔
اُس نے چوری کی سزا میں اُس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے۔ وہ اِسی بیچارگی کی حالت میں تھا کہ گنگا تیلی اُدھر آ نکلا۔

گھر میں اولاد نہ تھی۔ اس ٹنڈ منڈ ہی کو غنیمت سمجھ کر اپنے گھر پر لے گیا۔ علاج کیا تو اچھا ہو گیا۔ کولھو چلانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ ایک دن رات کو کولھو چلا رہا تھا اور دیپک راگ گا رہا تھا۔ راجہ کی بیٹی نے اُس وقت محل کا چراغ گُل کرنے کا حکم دیا؛ مگر چراغ جب بجھائے جاتے، تو راگ کے سروں کے اثر سے جل اُٹھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ گنگا تیلی کے گھر میں کوئی شخص دیپک راگ گا رہا ہے۔ صبح کو اُس نے راجہ کے سر ہو کر شادی کا پیغام گنگا تیلی کے گھر بھجوایا۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد تقدیر سے ہاتھ پاؤں بھی نکل آئے۔ کاٹ کی مورتی نے بھی ہار اُگل دیا۔ راج پاٹ بھی دوبارہ نصیب ہوا۔ راج ملنے کے بعد راجہ بھوج نے گنگا تیلی کو ہمیشہ اپنا باپ سمجھا اور اس کو مالا مال کر دیا۔

تلمیحات کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت

اُردو زبان کی ادبی اور غیرادبی تلمیحات پر ہم کافی بحث کر چکے ہیں اور ہر قسم کی تلمیحات کی مثالیں بھی ہم نے تحریر کر دی ہیں۔ ہم نے اِس مضمون میں تمام تلمیحات کو گھیر لینے کی کوشش نہیں کی؛ تاہم اگر وہ تمام تلمیحیں جو ہماری زبان کی نظم و نثر میں مستعمل ہیں یا عام بول چال میں رائج ہیں، ایک جگہ جمع کر دی جائیں، تو اُن پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص اس نتیجے پر پہنچ جائیگا کہ اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ ہزاروں خیالات ہیں، جن کے ادا کرنے کے لیئے ہمارے پاس موزوں قالب نہیں ہیں۔ یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں میں تلمیحات کی یہ کثرت ہے کہ اُن کے لیئے مستقل فرہنگیں تیار کی جاتی ہیں جن میں فرہنگ نگار اُن تلمیحوں کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے جمع کرتے ہیں اور ہر تلمیح کی تشریح کرتے ہیں۔ اگرچہ تلمیحات کی کثرت کے سبب باشندگانِ یورپ ہر قسم کے خیالات کو مناسب سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں۔ تاہم اُن کی پیاس نہیں بجھی۔ وہ دُنیا کی مختلف قوموں کی دیوتاؤں کے قصے معلوم کرتے ہیں۔ اُن کے مذہبی عقائد اور اوہام کا سراغ لگاتے ہیں اُن کی تاریخوں کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اُن کے مذہبی اور غیر مذہبی افسانوں کو اپنی زبانوں کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اُن کے شاعرانہ خیالات پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے ناٹکوں کو ترجمہ کا لباس پہناتے ہیں۔ اور اس تمام ذخیرہ سے ادبیات کے لیئے تلمیحیں اخذ کرتے ہیں تاکہ اُن کو ہر قسم کے خیالات و افکار کے ادا کرنے کا سامان پہلے سے زیادہ میسر ہو۔ برخلاف اس کے ہمارے ہم زبان قدامت پرست ہیں۔ اگر غیر زبان کے کسی لفظ میں اہلِ فارس نے تغیر و تبدل کیا ہے یا عربوں نے کوئی تبدیلی کی ہے تو اُس کو جائز سمجھتے ہیں۔ اگر ایرانیوں نے غیر زبان کے کسی لفظ کے ساتھ اپنا لاحقہ یا سابقہ لگا کر کوئی نیا لفظ بنا لیا ہے تو اُس کو بھی واداری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر عربوں نے غیر زبان کے کسی لفظ سے کوئی نیا مصدر بنا لیا ہے تو اُس پر بھی ناک بھوں نہیں چڑھاتے۔ اگر اہلِ ایران یا اہلِ عرب میں

سے کسی نے کوئی نئی تلمیح کسی تاریخ یا افسانہ کی بنیاد پر وضع کر لی ہے، تو اس پر بھی رضامند رہتے ہیں؛ لیکن اگر ہمارے ملک کا کوئی آدمی غیر زبان کے کسی لفظ میں تصرف کرے، یا عربی فارسی کے کسی لفظ کے ساتھ ہندی زبان کا کوئی سابقہ یا لاحقہ لگائے، یا کسی لفظ پر مصدر کی علامت لگا کر کوئی نیا مصدر بنائے، یا کوئی جدید تلمیح استعمال کرے، تو اس پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی ہے اور قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ حضرات موجودہ زبان میں سے بہت سے الفاظ کو ترک کرتے جاتے ہیں اور اس پر فخر کا اظہار کرتے ہیں؛ مگر ایسی کوئی تدبیر نہیں کرتے، جس سے ہماری زبان وسیع ہو، ہمارے ادبیات کا دامن فراخ ہو۔ ہماری لغات میں الفاظ کی تعداد زیادہ ہو، ہمارے ادائے خیالات کے قوت میں ترقی ہو۔

اِس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ زبان سے غفلت کرنا ایک ایسا گناہ ہے، جو کسی طرح قابلِ معافی نہیں ہے۔ اخبار ویں رسالوں کے مرتّب کرنے والے، شاعر، انشا پرداز اور مصنف، جنھوں نے اب تک زبان کی طرف سے غفلت کا اظہار کیا ہے، اگر چاہیں، تو نئے الفاظ، نئے محاورات، نئے استعارات، نئی اصطلاحات اور نئی تلمیحات سے ہماری زبان کو مالا مال کر سکتے ہیں۔ میں عام زبان کی توسیع پر یہاں اظہارِ خیالات نہیں کرتا۔ صرف تلمیحات پر بحث کرنی چاہتا ہوں۔ موجودہ تلمیحات کا بیشتر حصّہ عرب و ایران سے لایا گیا ہے۔ ہندوستانی تلمیحات عام بول چال میں کسی قدر ہیں؛ مگر وہ لائقِ شمار نہیں ہیں۔ ہندوستان کی زبانوں اور اُن کے ادبیات سے نفرت و گریز کرنے کے بعد کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اُردو زبان کو ہندوستان کی مشترک زبان کا خطاب دیں۔ اگر آپ جرمن، فرانسیسی، یا انگریزی زبان کی لغات کھول کر دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے تمام دنیا کی زبانوں اور ادبیات سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ کوئی مذہب کوئی زبان کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں ملیگی، جس کے عقائد، رسوم، اوہام، تاریخ اور ادب کے متعلق ضروری الفاظ ان ترقی یافتہ زبانوں میں موجود نہ ہوں۔ گویا اُنھوں نے اپنی زبانوں کے ادب کو ایک عالمگیر ادب بنا دیا ہے۔ کیا ہمارے لیئے یہ بات شرم کی نہیں ہے کہ ہم نے اپنی زبان کو اب تک ہندوستانی زبان کہلانے کا مستحق بھی ثابت نہیں کیا۔ اگر ہم فراخ دل ہوتے، اگر ہم میں تعصب کی جھلک نہ ہوتی، اگر ہم کو اپنی زبان سے محبت ہوتی، اگر ہم اپنی زبان کے ساتھ اپنے وطن کی عزت بھی کرنا چاہتے، تو ہمارا فرض تھا کہ جتنی قومیں ہندوستان میں آباد ہیں، اُن کے عقائد و اوہام، اُن کے رسم و رواج اور اُن کی تاریخ و ادب کے تمام ضروری الفاظ اپنی

زبان میں داخل کر لیتے اور اس کا دایرہ اس قدر وسیع کرتے کہ ہندوستان کی کوئی موجودہ زبان اُس کا مقابلہ نہ کر سکتی
اگر عام بول چال میں تغیر و تبدل کرنے کا اختیار ہم نہیں رکھتے، تو یہ بات تو ہماری قدرت میں ہی کہ ہم اپنے ادبیات
کا دائرہ وسیع کر دیں اور اُس کو ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ باشندوں کے لیئے قابل مُطالعہ اور لائقِ انس بنا دیں
اُردو زبان کے بنانے میں ہندو مُسلمان دونوں شریک ہیں پھر کیا وجہ ہی کہ اُس کے ادب میں صرف اسلامی ادبیات
کے آثار موجود ہیں ۔ ہندو قوم کے ادبیات کا کوئی نشان نہ ہماری نثر میں ہی، نہ نظم میں ۔

شاید ایک معترض اس موقع پر یہ اعتراض اُٹھائے کہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد، اُن کے دیوتاؤں کے قصّے، اُن کے
شگون و اوہام، اُن کی تاریخ کی غیر مُعتبر کہانیاں اس قابل نہیں ہیں کہ مُسلمان اُن کو تسلیم کریں ۔ حالاں کہ وہ توحید کے
ماننے والے ہیں اور معقول پسند ہیں ۔ اس کا جواب یہ ہی کہ اب بھی ہمارے ادب میں ایسی سینکڑوں باتیں داخل ہیں،
جو نہ مذہب کے لحاظ سے قابلِ تسلیم ہیں، نہ عقل کے لحاظ سے ۔ اگر ہم مذہب یا عقل کا پاس کرتے ہیں، تو لازم ہی کہ ہم
تمام ایسی باتوں کو اپنے ادبیات سے نکال دیں ۔ یہ تو ایک الزامی جواب ہی ۔ اصلی اور حقیقی جواب یہ ہی کہ شاعری
اور انشا پردازی میں ایسی تمام باتیں اس لیئے داخل نہیں کی گئیں کہ وہ مذہبًا یا عقلًا لائقِ تسلیم ہیں؛ بلکہ اس لیئے
داخل کی گئی ہیں کہ وہ اداے خیالات کے سانچے ہیں ۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ " ہمالیہ پہاڑ دیو کی طرح سینہ تانے کھڑا ہی
اور ہندوستان کو اپنی آغوش میں لینے کے لیئے تیار ہی " تو اُس فقرہ سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ اس کا کہنے والا
دیو کے وجود کا قائل ہی ۔ مطلب صرف یہ ہی کہ ہمالیہ کے بلند سلسلہ نے ہندوستان کو ایک طرف سے گھیر رکھا ہی ۔ اسی
طرح اگر کوئی کہے کہ " روزگار عنقا ہو گیا ہی " تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائیگا کہ روزگار نہیں ملتا ۔ نہ یہ کہ اس فقرہ کا بولنے
والا عنقا کے معدوم ہونے کا اظہار کر رہا ہی ۔ ہر شخص جو کسی ناول یا ناٹک کو پڑھتا ہی، اُسے اچھی طرح معلوم ہی کہ میں
ایک مصنوعی قصہ پڑھ رہا ہوں، تاہم جب کوئی ہنسی کی بات اُس میں آتی ہی، تو ہنس پڑتا ہی اور اگر کوئی دردانگیز واقعہ
پڑھتا ہی، تو اُس کے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں ۔ فطرتِ انسانی کے اس گُر سے ہر شاعر، ہر انشا پرداز
ہر قصہ نویس اور ہر واعظ اچھی طرح آگاہ ہوتا ہی؛ اِس لیئے وہ حقائق کو اُن فرضی و خیالی باتوں کے پیرائے میں پیش
کرتا ہی، جن سے اُس کے مخاطب مانوس ہوں ۔ اُس کو مطلق اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ لفافہ جس میں لپیٹ
کر وہ اپنے خیالات نظر کے سامنے لاتا ہی ۔ اصلی ہی، یا نقلی ۔ مولانا روم نے اسی نکتہ کو بیان کیا ہی، جہاں فرمایا ہی کہ

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

پس جب ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زبان میں اداے خیالات کے سانچوں کی تعداد بڑھا دیں اور اس غرض سے ہندو مذہب، ہندو دیو مالا، ہندو تاریخ اور ہندو ادب کی تلمیحات کا اضافہ کریں، تو اس سے ہمارے مذہب اور عقل پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ نہ کوئی چیز ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ان چیزوں کے وجود پر ہم یقین کریں۔ بلکہ اس اضافہ سے ہمیں حسب ذیل فوائد حاصل ہونگے:۔

(۱) مختلف خیالات کے ادا کرنے پر ہم پہلے سے زیادہ قادر ہو جائینگے۔

(۲) یہ الزام ہم پر سے دُور ہوگا کہ ہم محض مذہبی تعصب کی بنا پر ہندو ادبیات سے گریز کرتے رہے۔

(۳) ہندو ہمارے ادبیات سے پیشتر کی نسبت زیادہ مانوس ہو جائینگے۔

(۴) ہماری زبان صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان اور ہمارا ادب صحیح معنوں میں ہندوستانی کہلانے کا مستحق ہوگا۔

(۵) ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد مضبوط ہوگی اور حبِ وطن کے میدان میں آسانی سے دونوں قومیں ایک ساتھ دوڑینگی۔

اِس نقطے پر پہنچنے کے بعد ہم کو لازم ہے کہ ہندوؤں کے مندرجۂ ذیل ذخیرہ پر نظر ڈالیں اور اُن سے جدید تلمیحات حاصل کریں:۔

(۱) رامائن۔ (۲) مہابھارت (۳) ہندو عہد حکومت کی تاریخ

(۴) ہندو افسانے، مثلاً شکنتلا۔ نل دمن۔ وکرم اروسی وغیرہ (۵) ہندو دیو مالا

(۶) ہندو رسوم۔ (۷) ہندو فرقوں کے حالات و خیالات

اِس کے علاوہ اِسلامی ذخیرہ سے پیشتر کی نسبت زیادہ کام لینا چاہیئے اور اِس کے لیئے ذیل کے ذخیرہ پر نظر ڈالنی اور اُس سے تلمیحیں اخذ کرنی چاہئیں:۔

(۱) قرآنِ مجید (۲) احادیث (۳) اسلام کی عام تاریخ

(۴) اسلامی عہدِ حکومتِ ہند کی تاریخ

(۵) مثنوی مولانا رومؒ

(۶) الف لیلہ

(۷) شاہنامہ فردوسی

(۸) اُردو زبان کے مشہور قصے، مثلاً مولانا نذیر احمد کے تصنیف کردہ قصے۔ بوستانِ خیال۔ داستانِ امیر حمزہ چہار درویش۔ آرائشِ محفل یعنی قصۂ حاتم طائی۔ فسانۂ عجائب۔ بدرِ منیر وغیرہ

(۹) اسلامی تصوّف کی کتابیں

ہندو اور اسلامی ذخیرہ کے علاوہ ذیل کے مواد سے بھی تلمیحیں مل سکتی ہیں:۔

(۱) عیسائیوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۲) انگریزوں کی عام تاریخ

(۳) انگریزوں کی عہدِ حکومتِ ہند کی تاریخ

(۴) سکھّوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۵) پارسیوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۶) بودھ مت والوں کے مذہبی عقائد و رسوم

(۷) راجپوتوں کی تاریخ

(۸) مرہٹوں کی تاریخ

جدید تلمیحات کی مثالیں

یہاں ہم مثال کے طور پر چند نئی تلمیحات کا ذکر کرتے ہیں، جو عام ذخیرہ سے لی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ذیل کی تلمیحات پر غور کرو:۔

کال کوٹھری یا بلیک ہول۔ (انگریزی عہدِ حکومتِ ہند کی تاریخ سے) بادشاہ گرد (اسلامی عہدِ حکومتِ ہند کی تاریخ سے) الہ دین کا چراغ (الف لیلہ سے) تسمہ پا (الف لیلہ سے) کالی موت (یورپ کی عام تاریخ سے) چالیس ٹھگ (الف لیلہ سے) کھُل سمسم! بند ہو سمسم! (الف لیلہ سے) حمام باد گرد (قصۂ حاتم طائی سے)۔

خوجی (فسانۂ آزاد سے) ظاہر دار بیگ (توبۃ النصوح سے) فطرت (توبۃ النصوح سے)، کلیم (توبۃ النصوح سے) ربود لامہ (اسلامی تاریخ سے) رستمِ یک دست (شاہ نامۂ فردوسی سے) رشکِ حمار (خدائی فوج دار سے)۔ خواجہ سگ پرست (چہار درویش سے)، دیوِ سفید (شاہ نامۂ فردوسی سے) گلا بو (خدائی فوج دار سے) دیوانی پارلیمنٹ (انگریزوں کی عام تاریخ سے)، پگوڈا (بودھ مت والوں کے مذہب سے)، جیمل فتا (راجپوتوں کی تاریخ سے)، عشائے ربّانی (عیسائیوں کے مذہب سے) نوشابہ (سکندر نامہ سے)، جانِ عالم کا طوطا (فسانۂ عجائب سے) گل کا گھوڑا (بدرِ منیر سے)، نروان (بودھ مت والوں کے مذہب سے) دخمہ (پارسیوں کے مذہب سے) امرت۔ (سکھوں کے مذہب سے) کرپان (سکھوں کے مذہب سے) زنّار (پارسیوں کے مذہب سے) مہ آباد (پارسیوں کی تاریخ سے) بہنام (پارسیوں کے مذہب سے) خوجی کی قرولی (فسانۂ آزاد سے) رستم و اسفندیار کی سرزمین سے ایران مُراد ہے۔ طلوعِ آفتاب کی سرزمین سے جاپان مُراد ہے۔ آسمانی سلطنت سے چین کی سلطنت مُراد لو۔ فراعنہ کی سرزمین سے مصر کا ملک مُراد ہے۔ دیوتاؤں کی سرزمین سے ہندوستان سمجھو۔ روحانیت کی سرزمین ایشیا۔ مادیت کا گہوارہ، یورپ۔ کروڑپتیوں کا ملک، امریکہ عہدِ ظلمت (یورپ کی تاریخ سے) عہدِ اصلاح (یورپ کی تاریخ سے)، تاریک برِ اعظم سے افریقہ مُراد ہے۔

ہندو ادبیات کی تلمیحیں

نئی تلمیحات کی جو مثالیں ہم نے دی ہیں، وہ بہت ہی کم ہیں۔ اگر ہم عام ذخیرہ کو سامنے رکھ کر تلاش کریں، تو بلاشبہ بہت سی نئی تلمیحات ملیں گی؛ لیکن ہم اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ اُن تلمیحات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو ہندو ادبیات سے لی جا سکتی ہیں اور جن سے ہمارے ادب کے قالب میں نئی روح پیدا ہو سکتی ہے اور جن کے اضافہ کے بعد ہم اپنی زبان اور ادب کو دونوں قوموں کا مشترک سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ ذیل کی تلمیحات پر غور کی نظر ڈالو اور دیکھو کہ شاعری اور انشا پردازی میں ان سے کیا کام لیا جا سکتا ہے اور کون سے خیالات ان سانچوں میں ڈھالے جا سکتے ہیں:۔

ساوتری راجہ اشوپتی کی لڑکی تھی۔ وہ اپنے شوہر ستیوان پر دل سے فریفتہ تھی؛ شادی کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ وہ ایک سال سے زیادہ زندہ نہ رہیگا۔ موت کے وقت اُس نے فرشتۂ موت یم سے اس قدر التجائیں کیں اور اس قدر اصرار کیا کہ وہ ستیوان کی روح قبض کرنے سے باز رہا۔

یم مردوں کی روحوں کا دیوتا ہے۔ اُس کا رنگ سبز ہے۔ پوشاک سرخ ہے۔ ایک ہاتھ میں بھالا، دوسرے ہاتھ میں پھانسی کی رسّی ہے۔ ایک بھینسے پر سوار رہتا ہے۔ یم پوری وہ مقام ہے جہاں وہ رہتا ہے۔ کالی چی اُس کے محل کا نام ہے۔ اُس کے ملازم یم دوت کہلاتے ہیں۔ جب کوئی مرتا ہے، تو یم دوت اُس کے روح کو لا حاضر کرتے ہیں۔ اُس کی نیکیوں اور بدیوں کا دفتر کھولا جاتا ہے۔ پھر آخری حکم اُس کی نسبت صادر کیا جاتا ہے کہ وہ پتھروں میں داخل ہو، یا دوزخ میں جائے، یا دنیا میں کسی اور صورت میں جنم لے۔ دو خوف ناک کتے اُس کی گزرگاہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کی چار آنکھیں ہیں نتھنے کشادہ ہیں وہ یم کی طرف سے موت کا پیغام پہنچاتے ہیں۔

شت روپا سب سے پہلی عورت ہے، جو دنیا میں پیدا ہوئی۔ جیسے مسلمانوں کے نزدیک حوّا۔ کہتے ہیں کہ برہما جی نے اپنے جسم کے دو حصے کئے ایک حصے سے ایک مرد بنایا، جس کا نام وِراج ہے۔ دوسرے حصے سے عورت اور وہ یہی شت روپا ہے۔

شکنتلا راجہ بھرت کی والدہ کا نام ہے۔ یہ وہی بھرت ہے، جس کے نام سے ہندوستان کا نام بھارت ورش ہُوا اور جس کی اولاد جنگ مہابھارت میں معرکہ آرا ہوئی۔ یہ نامور رشی وشوامتر کی لڑکی تھی؛ مگر رشی کنو نے اُس کی پرورش کی اور اب اُسی کی بیٹی کہلاتی ہے۔ جب یہ جوان ہوئی، تو اتفاق سے راجہ دوشنیت سیر شکار کی تقریب سے رشی کنو کے آشرم کے قریب جا نکلا اور اُس کو دیکھ کر فریفتہ ہوگیا۔ شکنتلا نے اُس کے ساتھ شادی کرلی؛ مگر اُس کے ساتھ نہیں گئی۔ چلتے وقت راجہ نے اپنی ایک انگشتری بطور محبت کی یادگار کے اُس کو دی۔ راجہ کے جانے کے بعد شکنتلا اُس کی محبت میں از خود رفتہ رہنے لگی۔ ایک دن ایک رشی اُس رشی سے ملنے کے لئے آیا، جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ شکنتلا نے عاشقانہ بے خودی کے عالم میں رشی مذکور کی تعظیم نہیں کی۔ اُس نے بد دعا دی کہ تیرا شوہر تجھے بھول جائیگا۔ شکنتلا نے نادم ہوکر معافی مانگی۔ رشی مذکور نے اپنی بد دعا میں اس قدر ترمیم کی کہ جب راجہ دوشنیت اپنی انگشتری دیکھیگا، تو اُس کے دل میں تیری یاد تازہ ہو جائیگی۔ شکنتلا جب حاملہ ہوئی، تو اپنے خاوند کے پاس جانے لگی۔ رستے میں وہ ایک چشمے میں نہانے کے لئے اُتری اتفاق سے انگشتری اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور چشمے میں گر پڑی۔ مگر اُس کو خبر نہیں ہوئی۔ جب وہ راجہ کے پاس پہنچی، تو اُس نے نہیں پہچانا۔ مجبوراً اُس کی والدہ اُسے جنگل میں واپس لے آئی۔ یہاں اُس کے بطن سے بھرت پیدا ہُوا۔ کچھ عرصے کے بعد

ایک ماہی گیر اُس چشمے کے کنارے پہنچا، جہاں شکنتلا نے غسل کیا تھا۔ ایک مچھلی اُس کے جال میں آئی۔ جب اُس کا پیٹ چاک کیا، تو اُس میں سے ایک انگشتری نکلی۔ ماہی گیر وہ انگشتری راجہ دوشنیت کے پاس لے گیا راجہ نے اپنی انگشتری کو پہچانا۔ فوراً اُس کے دل میں شکنتلا کی یاد تازہ ہوئی۔ اُس نے جنگل سے اُس کو اور اُس کے لڑکے بھرت کو اپنے پاس بُلا لیا۔

ارجن راجہ پانڈو کا لڑکا رانی کُنتی کے بطن سے تھا۔ اُس کی بہادری، سپہ گری، اور تیر اندازی کی داستانیں مشہور ہیں۔ وہ اپنے تیروں سے بارش اور ہوا کو روک دیتا تھا اور اگر چاہتا، تو اُن سے آگ اور پانی برساتا تھا۔ جنگ کے وقت وہ کبھی بلند قامت نظر آتا تھا، کبھی پست قد، کبھی لاغر دکھائی دیتا تھا اور کبھی فربہ، دروپدی کے سویمبر میں بہت سے شاہزادے اور بہادر آدمی حاضر تھے؛ مگر دروپدی کو اُس کے سوا کوئی حاصل نہ کر سکا۔ اگنی دیوتا نے اُس کو اپنی کمان عطا کی تھی۔ شیوجی نے اپنا طاقتور ہتیار پشوپت دیا تھا۔ کوویر، ورن اور یم دیوتاؤں نے بھی اُسے خاص اسلحہ عنایت کئے تھے۔ اندر دیوتا نے ایک سنکھ دیا تھا۔ پھونکنے کے وقت اِس سے بادل کی گرج پیدا ہوتی تھی۔ مہابھارت کی جنگ میں اُس نے کوروؤں کا ناطقہ بند کر دیا اور بہادری و دلیری کے بڑے بڑے کارنامے دکھائے۔ ایک عہد شکنی کے سبب اُسے بارہ برس تک جلاوطن رہنا پڑا۔ جب راجہ یدھشٹر نے ایک گھوڑا اِس غرض سے چھوڑا کہ وہ تمام ہندوستان میں ہر راجہ کی عملداری سے گزرے اور تمام راجہ یہ مانکر کہ راجہ یدھشٹر سب سے بڑا راجہ ہے، اِس گھوڑے کو گرفتار نہ کریں، تو ارجن فوجِ کثیر لے کر اُس گھوڑے کے پیچھے چلا، تاکہ اگر کوئی راجہ یدھشٹر کے دعوے کو رد کرے اور گھوڑے کو گرفتار کرنا چاہے، تو اُس سے جنگ کرے۔ چنانچہ بہت سے راجاؤں سے ارجن لڑا اور گھوڑے کو بہ حفاظت تمام واپس لایا۔ گویا اُس کی بہادری کے سبب راجہ یدھشٹر چکرورتی راجہ مان لیا گیا۔ سری کرشن جی مہابھارت کی جنگ میں ارجن کے رتھ بان تھے۔ اُردو زبان کے قدیم شاعروں نے ارجن کی تیر اندازی اور کمان داری کا ذکر تلمیحاً کیا ہے۔

سدیومن کا ذکر پرانوں میں آتا ہے۔ لکھا ہے کہ منو دئی دسوت کو بڑی آرزو تھی کہ اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ اِس خیال سے اُس نے ورن اور متر دیوتاؤں کے نام پر ایک یگ کیا؛ مگر یگ کے انتظام میں کچھ غلطی واقع ہوئی۔ اِس لیے لڑکے کی جگہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اِس کا نام اِلا رکھا گیا۔ منو دئی دسوت نے جب بہت

التجا کی، تو دیوتاؤں نے رلا کو لڑکے کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اب اس کا نام سدیومن ہوا۔ جوان ہونے پر سدیومن سیر و شکار کی غرض سے اتفاقاً اُس جنگل میں جا نکلا، جس کو شیوجی نے بد دعا دی تھی۔ بد دعا کے اثر سے اس جنگل کا یہ خاصہ ہو گیا تھا کہ اگر کوئی مرد وہاں قدم رکھتا تھا، تو عورت بن جاتا تھا۔ چنانچہ سدیومن اُس جنگل میں پہنچتے ہی پھر عورت ہو گیا۔ اس کے بعد شیوجی کی عنایت سے یہ بات حاصل ہو گئی کہ وہ ایک مہینے مرد رہتا تھا اور ایک مہینے عورت۔ دونوں حالتوں یعنی مردانی اور زنانی حالت میں اس سے اولاد ہوئی۔

اروشی بہشت کی ایک اپسرا یعنی حور تھی۔ ورن اور متر دیوتاؤں نے اُس کی کسی حرکت سے ناراض ہو کر بد دعا دی تھی۔ اس سبب سے وہ زمین پر پھینکی گئی۔ یہاں راجہ پورروجو وکرم کے نام سے مشہور ہے، اُس پر فریفتہ ہوا۔ اُس نے چند شرائط کے ساتھ راجہ کی بیوی بن کر رہنا منظور کیا۔ اُن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ بجز خاص وقت کے میرے سامنے کبھی برہنہ نہ ہونا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دو مینڈھے جن کو میں عزیز رکھتی ہوں، میرے بستر کے قریب بندھے رہیں اور تمھیں اُن کی حفاظت کرنی پڑیگی۔ کچھ عرصے کے بعد راجہ اندر نے چاہا کہ اروشی بہشت میں واپس بلائی جائے۔ جو جاسوس اُس کام کے لیے مامور ہوئے تھے، اُنھوں نے اندھیری رات میں آکر دونوں مینڈھے چرا لیے۔ اروشی نے غل مچایا، تو راجہ برہنگی ہی کی حالت میں تلوار ہاتھ میں لے کر چوروں کے تعاقب میں نکلا۔ راجہ اندر کے جاسوسوں نے عین اُس وقت بجلی چمکائی، جس کے سبب راجہ کا برہنہ جسم اروشی کو نظر آیا۔ عہد ٹوٹ گیا۔ وہ راجہ کی نظر سے فوراً غائب ہو گئی اور بہشت میں جا پہنچی۔ وکرم اُس کے فراق میں سخت ملول رہتا تھا اور آوارہ پھرنے لگا۔ اتفاقاً اُس نے کرکشیتر کے تالاب میں اروشی کو اپنی چار سہیلیوں کے ساتھ نہاتے دیکھا۔ اُس وقت اُس نے راجہ سے کہا کہ میں حاملہ ہوں۔ ایک سال گزرنے پر تمھارے پاس آؤنگی اور صرف ایک رات ٹھیرونگی۔ چنانچہ مدت مذکور گزرنے پر وہ راجہ کے پاس آئی۔ لڑکا جو اُس کے بطن سے پیدا ہوا تھا، راجہ کے حوالے کیا۔ رات بھر ٹھیر کر واپس چلی گئی۔ آخر میں دیوتاؤں کے مشورہ سے راجہ نے ایک یگ کیا اور اُس کے صلہ میں اروشی کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ اروشی اور وکرم کی محبت کا فسانہ ملک الشعرا کالیداس نے نہایت فصاحت سے اپنے ایک ناٹک میں بیان کیا ہے۔

سوریہ سورج سے مراد ہے۔ یہ بھی ایک دیوتا ہے۔ اِس کے بہت سے القاب ہیں مثلاً روشن۔ دن کا مالک

چشمِ عالم۔ سُنہری کرنوں والا وغیرہ اُس کے رتھ کے آگے سات گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ اُس کا قد کوتاہ، آنکھیں سُرخ اور رنگ تانبے کا سا ہے۔ اس کی بیوی کا نام سنجنا ہے۔ جو وشو کرما کی لڑکی تھی۔ سنجنا اُس کے جلوہ کی تاب نہ لاکر اُس سے جدا ہو گئی تھی؛ مگر وشو کرما نے سوریہ کو خراد پر چڑھا کر پاؤں کے سوا ہر طرف سے چھیل ڈالا، جس سے اُس کی روشنی کا آٹھواں حصّہ کم ہو گیا۔ پھر سنجنا اُس کے ساتھ رہنے لگی سورج بنسی راجا سوریہ ہی کے نسل سے ہیں۔

سوم چاند کو کہتے ہیں۔ یہ بھی دیوتا ہے۔ نباتات کا پرورش کرنے والا اور عابدوں کا نگہبان کہلاتا ہے۔ اس نے دکش کی ستائیس لڑکیوں سے بیاہ کیا۔ یہی لڑکیاں ہیں جنھیں نچھتر یعنی چاند کی منزلیں کہتے ہیں۔ چندر بنسیوں کا سلسلہ سوم ہی سے چلا ہے۔ جس رتھ پر وہ سوار ہوتا ہے، اُس کے تین پہیے ہیں۔ سفید رنگ کے دس گھوڑے اِس رتھ کو کھینچتے ہیں۔ اِس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ مثلاً ٹھنڈی کرنوں والا۔ سفید کرنوں والا۔ ستاروں کا مالک۔ رات کا روشن کرنے والا وغیرہ۔

کام جسے کام دیو بھی کہتے ہیں، عشق کا دیوتا ہے۔ جب خدا نے چاہا کہ دنیا کو پیدا کرے۔ اُس وقت کام خود بخود اُس کے دل میں پیدا ہو گیا۔ یہ بہشت کی حوروں اور آسمانی پریوں کا مالک ہے۔ تیر کمان اس کے ہتیار ہیں۔ تیروں میں رنگ برنگ کے پھول لگے ہیں۔ وہ ایک حسین نوجوان ہے۔ طوطے پر سوار ہے۔ اِس کے جلو میں حوروں اور پریوں کے جھمگٹ ہیں۔ ہاتھ میں سرخ رنگ کا ایک علم ہے، جس کے پھریرے پر مچھلی کا نشان ہے۔ اِس کے بہت سے صفاتی نام ہیں۔ مثلاً حسین۔ شعلہ زن۔ شاداں۔ شوخ وشنگ۔ سراپا خرّمی۔ مردم فریب۔ شمع بہار۔ چھتا انگارہ۔ عصائے قہر۔ حُسن کا ہتیار۔ صلح شکن۔ عیّاش۔ دنیا کا اتالیق۔ کانِ محبت۔ پھولوں سے مسلح۔

لچھمی یا لکشمی دولت کی دیوی ہے۔ دیوتاؤں اور اُسروں نے سمندر کو بلویا تھا، تو اور رتنوں کے ساتھ لچھمی بھی سمندر سے کنول کا پھول ہاتھ میں لیئے نکلی تھی۔ جب سری رام چندر جی نے اوتار لیا، تو یہ سیتا جی کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ سری کرشن جی کے زمانے میں اُس نے رکمنی کا قالب اختیار کیا۔ دولت وحشمت کی دیوی ہونے کے سبب ہر جگہ اِس کے پرستش کی جاتی ہے۔ اس کو ہیرا، اندرا، اور چنچلا بھی کہتے ہیں۔

اگنی قدیم زمانہ کا دیوتا۔ اس کی تین شکلیں ہیں۔ آسمان پر سورج۔ ہوا پر بجلی۔ زمین پر آگ۔ اس کی سات زبانیں ہیں۔ ہون کے وقت آگ میں جو گھی ڈالا جاتا ہی، یہ ان زبانوں سے اُس گھی کو چاٹتا ہی۔ اس کی پوشاک سیاہ رنگ کی ہی۔ سر پر دھوئیں کا تاج ہی۔ ایک روشن ہتیار اُس کے ہاتھ میں ہی۔ سات ہوائیں اُس کے رتھ کے پہیے ہیں۔ سرخ رنگ کی گھوڑی اُس کے رتھ میں جوتی جاتی ہی۔ ایک مینڈھا اُس کے ساتھ رہتا ہی۔ کبھی کبھی یہ دیوتا اُس پر سوار ہوتا ہے۔

اندر آسمان، ہوا، بادل، بہشت اور حوروں کا مالک ہی۔ اس کا درجہ سب دیوتاؤں سے بڑا ہی۔ اگنی کی طرح ویدوں کی بہت سی رچائیں اُس کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اس کا رنگ لال کندن جیسا ہی۔ بازو لمبے لمبے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے جو شکل چاہے، اختیار کر لیتا ہی۔ اُس کی سواری کا رتھ چمکیلا ہی۔ دو سرخ رنگ کے گھوڑے اُس میں جوتے جاتے ہیں۔ اِس کا خاص ہتیار وجر ہی۔ کمان اور جال بھی ساتھ رکھتا ہی۔ چونکہ وہ ہواؤں کا مالک ہی۔ اِس لئے موسموں کا انتظام اور بارش کا اہتمام اِسی کے اختیار میں ہی۔ وہ برق اور رعد کو مناسب موقعوں پر مامور کرتا ہے۔ بارش برساتا ہی۔ بجلی چمکاتا ہی۔ زمینوں کو سرسبز کرتا ہی۔ بجلی اور طوفان پر حکمرانی کرتا ہی۔ اِس کے بدن پر ہزار آنکھوں کے نشان ہیں۔ راون والی لنکا کا بیٹا میگھ ناد اُس کو گرفتار کر کے لنکا لے گیا تھا۔ اِسی سبب سے میگھناد کو اندرجیت کہتے ہیں۔ دیوتا اُسے لنکا سے چھڑا کر لائے وہ رشیوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لئے اُن کے پاس بہشت کی حوروں کو بھیجا رہتا ہی۔ برج کے باشندے پہلے اندر کی پرستش کیا کرتے تھے۔ سری کرشن جی نے اُن کو اندر کی پرستش سے منع کیا۔ اندر نے ناراض ہو کر اُن کی سزا کے لئے بارش کا طوفان بھیجا۔ سری کرشن جی گوبردھن پہاڑ کو اپنی ایک اُنگلی پر لے کر کھڑے ہو گئے۔ تمام برج باشی اس پہاڑ کے نیچے آ گئے اور اُن کو طوفان سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ وہ ایک سفید ہاتھی پر سوار ہوتا ہی، جس کا نام اراوت ہی۔ اِس کے کئی صفاتی نام ہیں۔ مثلاً

وجر والا، دیوتاؤں کا سردار، ہوا کا مالک، بہشت کا مالک، اِس کے دار الحکومت کا نام امراوتی اور اِس کے رتھ کا نام ومان ہی۔

مہادیوی، یا پاربتی، شوجی کی بیوی کو کہتے ہیں۔ مختلف صفات و افعال کے لحاظ سے اس کی مختلف

نام ہیں۔ مہربانی کی حالت میں وہ حسبِ ذیل ناموں سے پکاری جاتی ہے:۔

مادرِ دُنیا، زرد فام اور درخشاں، ہردم شادماں۔ متوالی آنکھوں والی، مگر جب غضب ناک ہوتی ہے تو حسبِ ذیل ناموں سے پکاری جاتی ہے:۔

دُرگا، کالی، خوف ناک، غضب ناک، لال دامنوں والی، اُس کے دس ہاتھ ہیں۔ ہر ہاتھ میں ایک ہتیار ہے۔ اُس کا رنگ زرد ہے۔ حُسن و جمال اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ عام حالت ہے، مگر غصّے کی حالت میں اُس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ ہاتھوں اور دانتوں سے خون ٹپکتا ہے۔ سانپ اُس کے جسم کو حلقہ کیئے ہوتے ہیں۔ گلے میں سروں اور کھوپریوں کی مالا ہوتی ہے۔ اُس کی پرستش اسی حالت میں کی جاتی ہے۔ اِس کی مورتی کے سامنے خون کبھی خشک ہونے نہیں پاتا۔

اہراون پاتال کا راجہ تھا۔ لنکا کی لڑائی میں جب میگھ ناد اور کُمبھکرن مارے جاچکے، تو راون نے اس سے مدد طلب کی۔ وہ بھبھیشن کے لباس میں سری رام چندر جی کے لشکر میں داخل ہوگیا۔ کسی نے اُس کو نہیں پہچانا۔ سری رام چندر جی اور لچھمن جی دونوں اُس وقت سو رہے تھے۔ وہ دونوں کو غفلت کی حالت میں اٹھالے گیا۔ پاتال پہنچ کر اُس نے چاہا کہ اپنے دیوتا کے سامنے دونوں کو ذبح کرے، ہنومان جی کو جب اِس واقعہ کی خبر ہوئی، تو فوراً پاتال میں گئے۔ وہاں یگ ہونے کو تھا۔ تمام سامان فراہم کرلیا گیا تھا۔ ہنومان جی یگ کا سارا سامان کھاگئے۔ اہراون کو قتل کیا اور دونوں بھائیوں کو واپس لشکر میں لے آئے۔

برہما، مخلوق کو پیدا کرنے والا دیوتا۔ رنگ سُرخ ہے۔ چار سر اور چار مونھ ہیں۔ چار ہاتھ اور آٹھ کان ہیں۔ ایک ہاتھ میں تلوار، ایک میں کمان، ایک میں مالا اور ایک میں وید ہیں۔ برہما جی کی سواری ہنس ہے۔ یہ وشنو جی کی ناف سے پیدا ہوئے ہیں۔ اِن کا ایک دن دو ارب سولہ کروڑ سال کے برابر ہے۔

بلرام، سری کرشن جی کے بڑے بھائی ہیں۔ اِن کا رنگ گورا تھا اور سری کرشن جی کا سانولا، دونوں وشنو جی کے اوتار ہیں، جنھوں نے سفید اور سیاہ رنگ میں ظہور کیا ہے۔ مرتے وقت اُس کے مونھ سے ایک سانپ نکلا تھا: اِس لیئے اُن کو شیش ناگ کا اوتار بھی کہتے ہیں۔ بلرام جی شراب پیا کرتے تھے۔ سری کرشن جی پرہیزگار تھے۔ بلرام جی نہایت تند مزاج تھے، مگر سری کرشن جی نرم طبیعت رکھتے تھے۔ بلرام جی کے ہتیار

ہل اور موسل ہیں۔

رام یعنی سری رام چندر جی، راجہ جسرت کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ راجہ جنک کی بیٹی سیتا سے اُن کی شادی ہوئی۔ راجہ جنک نے جب سویمبر کا جلسہ منعقد کیا، تو شرط یہ کی کہ جو بہادر آدمی میری کمان کو خم کر دیگا، سیتا کی شادی اُسی سے کر دی جائیگی۔ یہ کمان راجہ کو ر کو دشنو نے عطا کی تھی۔ سری رام چندر جی نے اس کمان کے تین ٹکڑے کر ڈالے اور سویمبر کی شرط کو پورا کر دیا۔ شادی کے بعد راجہ جسرت نے سری رامچندر جی کو تخت پر بٹھانا چاہا؛ مگر بھرت کی والدہ رانی کی کئی نے ایک باندی کے بہکانے سے راجہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بھرت کو تخت پر بٹھائے۔ اور رام چندر جی چودہ برس تک جلا وطن رہیں۔ سری رام چندر جی نے باپ کا کہنا منظور کیا۔ لچھمن جی اور سیتا کو ساتھ لے کر جنگل کو روانہ ہوئے۔ ان کی روانگی کے بعد راجہ جسرت کا انتقال ہو گیا۔ بھرت نے چترکوٹ پہنچ کر سری رام چندر جی کو واپس چلنے اور تخت نشیں ہونے کی صلاح دی؛ مگر اُنھوں نے یہ بات منظور نہیں کی۔ مجبوراً بھرت اُن کی کھڑاؤں لے گیا اور اُن کو تخت پر رکھ کر خود بطور نائب السلطنت کے راج کرنے لگا۔ دریائے گوداوری کے کنارے پنچ وٹی میں راون والیِ لنکا کی بہن سری رام چندر جی پر عاشق ہو گئی۔ بہت چاہا کہ اُن کو اپنی طرف مائل کرے؛ مگر کچھ اثر نہیں ہوا لچھمن جی نے اس گستاخی پر اس کے کان اور ناک کاٹ ڈالے۔ وہ روتی پیٹتی اپنے بھائی کے پاس پہنچی۔ نیز اُس نے سیتا جی کے حسن و جمال کی تعریف اِس قدر کی کہ راون اُن کے بھگا لینے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ عین اُس وقت جب کہ سری رام چندر جی اور لچھمن جی شکار کو گئے ہوئے تھے راون آیا اور سیتا جی کو جبر سے اپنے ساتھ لے گیا۔ دونوں بھائی جب شکار سے واپس آئے، تو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ راجہ سگریو جو ان اطراف میں حکمراں تھا، اُس نے اور اُس کے جنرل ہنومان نے لنکا پر چڑھائی کرنے میں مدد دی ہنومان سمندر پھاند کر لنکا پہنچا اور سیتا جی کی خبر لایا۔ پھر سمندر پر پل باندھا گیا بندروں اور ریچھوں کی فوج ہنومان کی سرکردگی میں لنکا پہنچی۔ راون کے ساتھ جنگ کی گئی۔ راون کے بیٹے اور اُس کا بھائی اور خود راون اس لڑائی میں قتل ہوا۔ لنکا فتح ہوئی اور سیتا جی نے قید سے رہائی پائی۔

راون والیِ لنکا نہایت شریر، ظالم اور بدی کا پتلا تھا۔ اُس کے دس سر تھے۔ بیس ہاتھ تھے۔ آنکھیں سرخ

تھیں۔ صورت خوفناک تھی۔ اس میں اس قدر طاقت تھی کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتا تھا۔ سمندر کو متحرک کر سکتا تھا۔ دیوتا اُس کی خدمتیں انجام دیتے تھے۔ اگنی دیوتا باورچی کا کام کرتا تھا۔ ورن دیوتا پانی بہم پہنچاتا تھا۔ کویر دیوتا دولت مہیا کرتا تھا۔ وایو دیوتا اُس کے محلات میں جھاڑو دیتا تھا۔ لنکا جس میں وہ حکومت کرتا تھا، اُس کے تمام مکانات سونے سے منڈھے ہوئے تھے اور جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔

کویر جن راتوں کا دیوتا ہے۔ کوہ ہمالیہ پر ایک شہر الکا ہے، جہاں اُس کا قیام ہے۔ سونا چاندی اور جواہرات سب اُس کے قبضے میں ہیں۔ اِس کا رنگ سفید ہے۔ اِس کے تین پاؤں ہیں۔ آٹھ دانت ہیں۔ سارا جسم زیورات سے ڈھکا ہے۔ اُس کو دھن پتی یعنی دولت کا مالک اور رتن پتی یعنی جواہرات کا مالک کہتے ہیں۔

وایو ہوا دن کا دیوتا ہے۔ اندر دیوتا کا رفیق ہے۔ اکثر اُس کے ساتھ ایک ہی رتھ پر سوار ہوتا ہے۔ خود اُس کا رتھ طلائی ہے جس میں ہزار گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ خوشبوؤں کا حامل اور دائم رواں اُس کے صفاتی نام ہیں۔

ورن سمندروں اور دریاؤں کا دیوتا ہے۔ اِس کا صفاتی نام جل پتی ہے۔ اُس کی سواری کا جانور مگرمچھ ہے۔

سرستی علم، عقل اور شاعری کی دیوی ہے۔ رنگ سفید ہے۔ ہاتھ میں کتاب ہے۔ سفید کنول کے پھول پر جلوہ افروز ہے، برہما جی اِس کے شوہر ہیں۔

کورم اوتار۔ اِس اوتار کی شکل کچھوے جیسی ہے۔ ایک دفعہ دیوتاؤں کے مقابلے میں دیتوں نے غلبہ پایا۔ اندر کی حکومت میں بھی خلل آگیا۔ برہما جی اور نارائن جی کی ہدایت سے دیوتاؤں نے مشورہ کیا کہ سمندر کو بلو کر اس میں سے امرت یعنی آبِ حیات نکالیں اور اُس کو نوش کر کے دیتوں کا مقابلہ کریں اور اُن کو مار کر آرام کی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ سمندر کے بلونے کے لئے کوہ مندھیاچل کی رئی بنائی گئی۔ شیش ناگ کی رسّی بنا کر اُس کے گرد لپیٹی اور سمندر کو سب دیوتاؤں نے بلونا شروع کیا؛ مگر کوہ مندھیاچل اپنے وزن کے سبب سمندر میں دبا جاتا تھا اور ایک مقام پر کھڑا نہیں رہتا تھا۔ کورم اوتار نے کچھوے کے روپ میں ظہور کیا۔ وہ سمندر میں اُتر گیا اور کوہ مندھیاچل کو اپنی پشت پر جما لیا۔ سمندر بلونے سے سب دیوی

چودہ رتن برآمد ہوئے :-

(۱) آمرت یعنی آبِ حیات - اسے دیوتاؤں نے پی لیا -

(۲) دھنونتری طبیب - یہ ایک ہاتھ میں جونک اور ایک ہاتھ میں ہلیلہ لیئے برآمد ہُوا -

(۳) لچھمی دیوی - یہ وشنوجی کے حصّے میں آئی -

(۴) شراب - اِسے دیتوں نے نوش کیا -

(۵) چاند - یہ شیوجی کے حصّے میں آیا -

(۶) رمبھا - یہ ایک حسین بہشتی حور تھی -

(۷) اچی شرو - یہ ایک اعلیٰ صفت گھوڑے کا نام ہے - اسے سورج نے لیا -

(۸) کوستبھ منی - اسے وشنوجی نے لیا -

(۹) پارجات جسے کلپ برکش بھی کہتے ہیں - یہ ایک بہشتی درخت تھا -

(۱۰) سُرَبھی - یہ ایک اعلیٰ صفت گائے تھی، جو رشیوں کو دی گئی -

(۱۱) ارآوت - یہ ایک نایاب ہاتھی تھا، جو اندر کے حصّے میں آیا -

(۱۲) سنکھ، جس کو پھونکنے سے بادل کی گرج پیدا ہوتی تھی - یہ وشنوجی نے لیا -

(۱۳) کمان - یہ ایک عجیب کمان تھی -

(۱۴) وِش -

متسیہ، اِس کے معنی ہیں مچھلی - یہ ایک اوتار کا نام ہے - راجہ منو جس نے دو لاکھ برس ریاضت کی تھی، ایک دفعہ دریائے کرت مالا میں اشنان کر رہا تھا - یکایک ایک خوب صورت مچھلی اُس کے ہاتھ آئی - راجہ اُسے ایک رات دن ہاتھ میں لیے رہا اور اُس کی خوب صورتی کو دیکھتا رہا - پھر اسے ایک گھڑے میں ڈالا؛ مگر وہ گھڑے میں نہ سمائی - راجہ نے اُسے ایک کنوئیں میں ڈال دیا؛ مگر کنوئیں میں بھی سما سکی - کنوئیں سے نکال کر اُسے ایک تالاب میں پہنچایا - جب تالاب میں بھی اُس کی گنجائش نہ ہوئی، تو دریائے گنگا میں ڈالی گئی - یہاں بھی اُس نے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور سارے دریا میں نہ سما سکی - مجبوراً اُسے سمندر میں پہنچایا - یہاں پہنچ کر

وہ اِس قدر پھیلی کہ تمام سمندر پر چھا گئی۔ اب راجہ سمجھا کہ یہ خدائی اسرار ہے۔ مچھلی نے راجہ سے کہا کہ ایک ہفتے کے بعد دریائے جلال موج زن ہوگا۔ طوفان کے سبب ساری دنیا پانی میں غرق ہو جائیگی۔ تم فلاں کشتی پر دیوتاؤں کے ساتھ بیٹھ جانا اور کشتی کو میرے اِس سینگ سے جو پیشانی سے نکلا ہوا ہے، باندھ دینا۔ چنانچہ طوفان آیا اور ستر لاکھ اٹھائیس ہزار برس تک رہا۔ تمام دنیا تباہ ہو گئی۔ صرف منو اور اُس کے ہمراہی محفوظ رہے۔ پھر منو کی نسل سے دُنیا دوبارہ آباد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک سرکش دیت جس کا نام سنکھا سر تھا، ویدوں کو چُرا کر سمندر میں چھپ گیا تھا۔ برہماجی کے فریاد کرنے پر یہ اوتار سمندر کی تہہ میں پہنچا اور دیت مذکور کو ہلاک کر کے ویدوں کو واپس لایا۔

وامن اوتار، جس کو باون اوتار بھی کہتے ہیں۔ اِس اوتار کے ظہور کا واقعہ برہمنوں نے اس طرح بیان کیا ہے:۔ دیتوں کا ایک راجہ تھا جسے راجہ بلی کہتے۔ اُس نے تینوں لوک اپنے قبضے میں کر لیئے تھے۔ دیوتاؤں کو شکست دے کر اُن کا ملک چھین لیا تھا۔ دیوتاؤں کی حمایت کے لیئے یہ اوتار نمایاں ہوا۔ عین اُس وقت جبکہ راجہ بلی یگ کر رہا تھا، یہ اوتار اُس کے پاس پہنچا اور اُس سے تین قدم زمین کا سوال کیا۔ راجہ نے اس سوال کو حقیر سمجھ کر کہا۔ سوال میرے درجے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ وامن نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔ راجہ نے اجازت دی کہ تین قدم ناپ کر زمین لے لے۔ وامن نے ایک قدم اوپر کے لوک پر رکھا۔ دوسرے قدم سے درمیانی لوک کو ناپا۔ تیسرے قدم کے لیئے کہا کہ ساری زمین میرے ایک قدم کے برابر ہے۔ راجہ اپنے اقرار پر ثابت قدم رہا اور اپنے تئیں اُس کے قدموں پر ڈال دیا۔ وامن جی نے خوش ہو کر پاتال کا ملک اُسے بخش دیا اور دیتوں کی صفات اُس سے دُور کر دیں۔

ورّاہ اوتار، اِس اوتار کے ظہور کا سبب یہ ہے کہ ایک نہایت سرکش اور طاقتور دیت ہرناکش نامی زمین کو چُرا کر سمندر میں پاتال تک کھینچ لے گیا تھا۔ برہماجی کی التجا پر اس اوتار نے نمایاں ہو کر ہاتھی کی شکل اختیار کی۔ سمندر میں کود کر اپنے بڑے دانت پر زمین کو رکھ لیا اور سمندر سے کھینچ لایا۔ پھر ہرناکش سے جنگ ہوئی، جو ایک ہزار سال تک جاری رہی۔ آخر ہرناکش مارا گیا۔

نرسنگھ اوتار، ہرناکش کا توام بھائی ہرناکاشیپ بھی نہایت ظالم اور مغرور تھا۔ شیوجی کی عبادت

کرنے سے اُسے یہ عطیہ ملا کہ نہ کوئی انسان اُسے ہلاک کر سکیگا، نہ کوئی حیوان۔ اُس کی موت نہ دن کے وقت ہوگی، نہ رات کو۔ وہ نہ آسمان پر مارا جائے گا، نہ زمین پر۔ اپنی موت کی طرف سے مطمئن ہو کر اُس نے سرکشی اختیار کی۔ دیوتاؤں سے لڑکر اُن کا سارا مُلک چھین لیا۔ اُس نے سارے مُلک میں منادی کر دی کہ میری حکومت میں کوئی شخص نارائن کا نام نہ لے۔ اُس کا بیٹا پہلاد خدا پرست تھا۔ اُس کو بہت سمجھایا کہ وہ خدا پرستی چھوڑ دے مگر اِس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک دفعہ پہلاد کے قتل کا ارادہ کر کے اُس نے تلوار اُٹھائی اور اُس سے کہا کہ اب دیکھوں تجھے میرے ہاتھ سے کون بچاتا ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے تلوار چمکائی کہ یکایک اُس کے قریب ایک ستون سے نرسنگھ اوتار نمایاں ہوئے۔ ان کا اوپر کا جسم شیر کا اور نیچے کا جسم انسان کا تھا۔ اُنھوں نے ہرناکاشپو کو پکڑ کر اپنے زانو پر بٹھالیا اور پنجے اور ناخنوں سے اُس کا پیٹ چیر ڈالا۔ اُس وقت شام کا وقت تھا۔ نہ دن تھا، نہ رات، اُس کی موت نہ آسمان پر ہوئی، نہ زمین پر اور نہ وہ کسی انسان کے ہاتھ سے مارا گیا، نہ حیوان کے ہاتھ سے۔ غرض کہ شیوجی کا کہنا ہر طرح پورا ہوا۔

پرسرام، یہ وشنوجی کا چھٹا اوتار ہے۔ سری رام چندر جی ساتویں اوتار تھے۔ یہ چھتریوں کا دشمن اور برہمنوں کا دوست تھا۔ اُس نے اکیس دفعہ چھتریوں سے جنگ کی اور اُن کو قتل کیا۔ سبب یہ تھا کہ ایک چھتری راجہ جس کا نام کارت دیریہ تھا اور جس کے ہزار ہاتھ تھے، ایک دفعہ اُس کے مکان پر آیا اور اُس کی غیبت میں اُس کی ایک اعلیٰ صفت گائے جس کا نام کام دھینو تھا، چُرا کرلے گیا۔ پرسرام کو جب اِس واقعہ کی خبر ہوئی، تو اُس نے راجہ کا تعاقب کیا اور اِس سے لڑکر اُس کے ہزار ہاتھ کاٹ ڈالے اور اُسے قتل کر دیا۔ پھر غصّے کی حالت میں بار بار چھتریوں سے جنگ کی اور پانچ جھیلیں اُن کے خون سے بھر دیں۔ پرسرام کے ہاتھ میں ہتیار کی جگہ ہمیشہ ایک کلھاڑی رہتی تھی۔

کرشن، یہ مشہور اوتار ہیں۔ والدہ کا نام دیوکی، والد کا نام واسدیو تھا۔ اُس زمانے میں متھرا کا فرماں روا راجہ کنس تھا، جو نہایت ظالم تھا، نجومیوں نے خبر دی تھی کہ دیوکی کا لڑکا تجھے قتل کریگا۔ چنانچہ اُس نے واسدیو اور دیوکی کو قید کرلیا۔ چنانچہ دیوکی کے کئی حمل کے لڑکے اُس نے مار ڈالے۔ آخری حمل میں سری کرشن جی ظاہر ہوئے؛ خدا کو منظور تھا کہ وہ اُس کے ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ وہ عجیب طریقے سے محفوظ رہے۔

جوان ہونے پر بھی کنس نے بہت تدبیریں کیں کہ ان کو قتل کرڈالے؛ مگر اس کا بس نہیں چلا اور آخر کار وہ خود سری کرشن جی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ ان کے عجیب عجیب کارنامے مشہور ہیں۔ جنگ مہا بھارت میں وہ پانڈو کی طرف تھے اور ان کی فوج کوروں کی طرف سے لڑ رہی تھی۔ آٹھ رانیاں تھیں؛ مگر ان کی محبوب لائق کا نام رادھا تھا۔

وشنو ہر دفعہ دنیا کے ظہور سے پہلے وشنو جی، شیش ناگ کے بستر پر لیٹے پانی پر تیرتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں ان کا نام نارائن ہے۔ یعنی پانی پر تیرنے والا۔ ان کی ناف کنول کے پھول سے مشابہ ہے۔ برہما جی انھیں کی ناف سے پیدا ہوئے۔ شیو جی ان کی پیشانی سے برآمد ہوئے۔ وشنو جی نے مختلف صورتوں میں ظہور کیا ہے۔ ان صورتوں کو اوتار کہتے ہیں۔ نو اوتار ظاہر ہو چکے ہیں۔ یعنی قلسیہ، کورم، وراہ، نرسنگھ، وامن، پرسرام، رام، کرشن، بدھ۔ نویں اوتار کا ظہور باقی ہے۔ اس آخری اوتار کو ہندو کلکی اوتار کہتے ہیں۔ گنگا وشنو جی کے پاؤں سے ظاہر ہوئی ہے۔ یہ دنیا کی حفاظت اور پرورش کرتے ہیں۔ ان کے ہزار نام ہیں۔ ان کی بیوی کا نام لچھمی ہے۔ رنگت سانولی ہے۔ شکل حسین ہے۔ چار ہاتھ ہیں۔ پانچ ہتیاروں سے مسلح رہتے ہیں۔ ان کی کمان کا نام شارنگ اور تلوار کا نام نندک ہے۔ ایک ہتیار کا نام سدرشن اور ایک کا نام گئوکھی ہے۔ چند صفاتی نام حسب ذیل ہیں:۔

لافانی، لاانتہا، سانپ کے بستر والے، چار ہاتھ والے، گایوں کے محافظ، عنصروں کے مالک، پانی پر سونے والے، لچھمی کے شوہر، پانچ ہتیاروں سے مسلح، کنول جیسی ناف والے، زرد پوشس، بہشت کے مالک وغیرہ۔

شیو، ان کو مہادیو بھی کہتے ہیں۔ یہ وشنو جی کی پیشانی سے ظاہر ہوئے۔ مختلف صفات کے سبب مختلف نام ہیں۔ تباہ اور غارت کرنے والی طاقت کے سبب ان کے نام ہیں مہاکال، سراپا غضب، لال جٹاؤں والے، اس حالت میں ان کی سواری کتا ہے۔ جسم پر سانپ لپٹے رہتے ہیں۔ شراب پی کر مست نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک نام بھوتیشور ہے۔ یعنی بھوتوں کے مالک، اس صفت کے سبب وہ قبرستانوں اور مسانوں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔ سر پر سانپوں کی جٹا، گلے میں کھوپریوں کی مالا ہوتی ہے۔ بھوتوں کی فوج

ساتھ رہتی ہے۔ بھوت اُن کے گرد مست ہوکر تیزی کے ساتھ ناچتے ہیں اور وہ خود بھی رقص کرتے ہیں۔ ان کے پانچ موٗنھ ہیں۔ تین آنکھیں ہیں۔ تیسری آنکھ پیشانی کے درمیان ہے، جس سے غصہ اور جلال ٹپکتا ہے۔ پیشانی کے گرد چاند حلقہ کیئے ہے۔ گلا زہر نوش کرنے کے سبب نیلگوں نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں ترسول ہے۔ پوشاک ہرن، شیر، یا ہاتھی کی کھال ہوتی ہے۔ نندی بیل ان کے ساتھ رہتا ہے۔ بعض صفاتی نام حسب ذیل ہیں:۔

تین آنکھوں والا، نیلے گلے والا، چاند جیسے تاج والا، جٹاؤں والا وغیرہ۔

ہنومان، راجہ سگریو کا جنرل جس نے سری رام چندر جی کو لنکا کی جنگ میں مدد دی۔ اس کی شکل بندر جیسی ہے۔ اِس کی خدمات دیوتاؤں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ وہ ہندوستان کے جنوبی کنارے سے پھاند کر لنکا پہنچتا ہے۔ سیتاجی کو سری رام چندر جی کا پیغام پہنچاتا ہے۔ راون کے باغ کو ویران کرتا ہے۔ جب اچھیوں نے اُس کی دُم پر روئی لپیٹ کر آگ لگادی، تو وہ اپنی دُم کی آگ سے تمام لنکا کو پھونک دیتا ہے۔ اُس کا رنگ نہ زرد سُرخ دہکتے سونے کی طرح درخشاں ہے۔ چہرہ لعل رمانی کی طرح نہایت سُرخ ہے۔ قد مثل بلند مینار یا پہاڑ کے ہے۔ وہ بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ پہاڑ کو سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ ہَوا پر اُڑتا ہے۔ بادلوں کو ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔ سورج کو اپنے موٗنھ میں چھپا لیتا ہے۔ اثنائے جنگ میں وہ کوہ ہمالہ سے دوائیں لاتا ہے، جس سے زخمی بندر تندرست ہوتے ہیں۔ جب لچھمن جی پر غشی طاری ہوتی ہے، تو وہ جیون بوٹی لاتا اور اُن کی غشی دُور کرتا ہے۔ اُس کا صفاتی نام مرت پتر یعنی ہَوا کا فرزند ہے۔ ہندوستان میں ہر جگہ اُس کی پرستش کی جاتی ہے۔

بھیشم، راجہ شانتو والی ہستناپور کا بڑا لڑکا تھا۔ اُس کی ماں کا نام گنگا تھا۔ گنگا ایک عہد شکنی کے سبب راجہ سے ناراض ہوکر چلی گئی تھی۔ راجہ نے ایک جوان اور حسین عورت ستیہ وتی سے شادی کرنی چاہی اُس کے والدین نے کہا کہ تمھارے بعد ستیہ وتی کی اولاد وارثِ تخت نہیں ہوگی؛ بلکہ یہ حق تمھارے بڑے بیٹے بھیشم کا ہے۔ اگر تم اقرار کرو کہ ستیہ وتی کی اولاد کو تخت دیا جائیگا، تو ہم اُس کی شادی کرنے پر راضی ہیں بھیشم کو جب یہ بات معلوم ہوئی، تو باپ کی آرزو پوری کرنے کے لیئے اُس نے یہ اقرار کیا کہ نہ میں خود شادی کرونگا، نہ تخت لونگا، اِس اقرار پر ستیہ وتی سے راجہ کی شادی ہوگئی۔ اِس شادی سے راجہ کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ راجہ کے مرنے کے بعد بھیشم نے بڑے لڑکے کو تخت پر بٹھایا؛ مگر وہ ایک جنگ میں مارا گیا۔

اُس نے اُس کے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر وہ بھی جوان اور لاولد مر گیا۔ بھیشم نے ستیہ وتی سے کہا کہ تم دیاس جی کو بُلا کر اپنے آخری بیٹے کی بیواؤں سے اولاد پیدا کراؤ۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ دو لڑکے اس طرح پیدا ہوئے۔ ایک کا نام پانڈو اور ایک کا نام دھرتراشٹر رکھا گیا۔ ان دونوں لڑکوں کی اولاد کورو اور پانڈو کے نام سے موسوم ہوئی۔ جب دونوں میں نفاق پیدا ہوا، تو وہ صلح کا مشورہ دیتا رہا؛ مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ جنگ شروع ہوئی۔ بھیشم کوروں کا طرف دار تھا۔ اِس کا مقابلہ ارجن سے ہوا۔ اُس کے تیروں سے اِس کا سارا جسم چھد گیا۔ دو انگل جگہ بھی زخموں سے خالی نہ رہی جب وہ رتھ سے نیچے گرا، تو تیروں کو کھڑا کر کے اُس پر سلایا گیا۔ زخم مہلک تھے؛ مگر اس حالت میں بھی وہ (۵۸) دن تک زندہ رہا اور اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتا رہا۔ تیروں کا بستر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بھیم پانڈو کا دوسرا شاہزادہ۔ یہ نہایت طاقتور، تندمزاج، بے رحم اور دراز قد تھا درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا تھا۔ طمانچہ مار کر ہاتھی کا مونھ پھیر دیتا تھا۔ گرز کی لڑائی اور کشتی میں بے نظیر تھا۔ اس کی خوراک بہت تھی جتنا کھانا اُس کے چار بھائی اور اُس کی والدہ کھاتی تھی، اتنا یہ اکیلا کھا جاتا تھا۔ دریودھن نے اُس کو حسد سے زہر کھلایا تھا؛ یہ بچ نکلا۔ جنگ مہابھارت میں اس نے بڑے بڑے کارنمایاں دکھائے؛ مگر دریودھن کے ساتھ قواعدِ جنگ کے خلاف فریب کی چال چلا۔ اِس کا صفاتی نام دراز بازو ہے۔

جٹایو گدوں کا بادشاہ تھا۔ جب راون سیتا جی کو لئے جا رہا تھا، تو اُس نے رستے میں روکا؛ مگر راون کے ہاتھ سے زخمی ہوا۔ سری رام چندر جی جب شکار سے واپس آئے اور سیتا جی کو تلاش کرنے لگے، تو اس نے پتہ بتایا اور سارا حال کہہ سنایا۔

رُدر طوفان اور ہواؤں کا دیوتا ہے۔ جو لوگ حیوانوں اور انسانوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، اُن کے لئے یہ دیوتا مہلک اور اُن کے سوا اوروں پر مہربان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوتا برہما جی کی پیشانی سے پیدا ہوا۔ اِس کا آدھا جسم عورتوں جیسا اور آدھا جسم مردوں جیسا ہے۔ جب برہما جی نے اُسے حکم دیا کہ وہ خلقت کو پیدا کرے، تو اُس نے بھوت اور راچھس پیدا کئے۔ یہ دیکھ کر برہما جی ناراض ہوئے اور اُنھوں نے کہا کہ اس بیہودہ مخلوق کو نابود کر کے اچھی مخلوق پیدا کرو۔ اُس نے کہا۔ میں ایسی مخلوق پیدا کرنا نہیں چاہتا، جو زندگی اور موت کے پنجے میں اسیر ہو۔ ایسی مخلوق آپ خود پیدا کریں۔

کمبھکرن راون کا بھائی تھا۔ اُس کی طاقت اور بھوک کا اندازہ لگانا محال ہے۔ وہ چھ مہینے سوتا اور ایک دن جاگتا تھا۔ راون نے اُس کو بیدار کرنا چاہا، تاکہ لڑائی میں مدد دے۔ بڑی مُصیبت سے جاگا۔ شراب کے ہزار گھڑے ہانی سے پینے گئے اور اس اقرار پر آمادۂ جنگ ہُوا۔ ہزاروں بندر اُس نے کھا ڈالے۔ بندروں کے سردار سگریو کو گرفتار کر کے لنکا میں لے گیا۔ آخر کار قتل ہُوا۔

شیش ناگ سانپوں کا راجہ ہے۔ پاتال کے ساتویں طبقے میں رہتا ہے۔ جب دنیا فنا ہوتی ہے، تو وشنو جی اُس کو اپنا بستر بنا کر پانی پر تیرتے ہیں اور یہ اپنے ہزار سروں سے اُن پر سایہ کرتا ہے۔ زمین اُسی پر ٹکی ہوئی ہے۔ جب وہ جمائی لیتا ہے، تو زلزلہ آتا ہے۔ جب دنیا کے خاتمہ کا وقت آتا ہے، تو اپنی پھنکار سے آگ نکالتا اور دنیا کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ اس کی پوشاک ارغوانی رنگ کی ہے۔ گلے میں سفید مالا ہے۔ ایک ہاتھ میں ہل اور ایک ہاتھ میں موسل ہے۔ بلرام جی اسی کے اوتار تھے۔ اِس کے محل کا نام منی منڈپ ہے۔

گنیش عقل کا دیوتا ہے، مُصیبتوں کا دُور کرنے والا ہے؛ اِسی لیئے ہر کتاب اس کے نام سے شروع کی جاتی ہے۔ اِس کا جسم پیڑا اور موٹا ہے۔ رنگ زرد ہے۔ پیٹ بڑا ہے۔ چار ہاتھ ہیں۔ سر ہاتھی کا ہے؛ مگر دانت صرف ایک ہے۔ ایک ہاتھ میں سنکھ، دوسرے ہاتھ میں چکر، تیسرے ہاتھ میں گدا اور چوتھے ہاتھ میں کنول کا پھول ہے۔ اس کی سواری کا جانور چوہا ہے۔ بعض صفاتی نام حسب ذیل ہیں:-

ایک دانت والا۔ فیل چہرہ۔ دراز گوش۔ کلاں شکم وغیرہ۔

شنی سوریہ کا لڑکا ہے اور ستاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رنگ سیاہ ہے۔ پوشاک بھی سیاہ رنگ کی ہے۔ اگر شنی اوپر کی طرف نگاہ کرے، تو تمام دنیا نیست و نابود ہو جائے؛ اِسی خیال سے وہ ہمیشہ سرنگوں رہتا ہے، تاکہ اُس کی نگاہ کسی پر نہ پڑے۔

مرت ہَوا کے طوفانوں کے دیوتا ہیں۔ اِن کی تعداد اُنچاس ہے۔ رعد و برق ان کے ہتیار ہیں۔ آندھی ان کی سواری ہے۔

دکش، برھما جی کا لڑکا ہے۔ برھما جی نے اسے پرجاپتیوں کا سردار بنایا۔ اس خوشی میں اُس نے ایک یگ کا اہتمام کیا، جس میں دیوتا اور رشی بُلائے گئے؛ مگر شیو جی نہیں بلائے گئے۔ شیو جی کی بیوی اُما یگ میں پہنچی؛ مگر اپنے

اور اپنے شوہر کی بے حرمتی دیکھ کر غیرت سے آگ میں جل گئی۔ دکش کو شیوجی سے عداوت تھی؛ اسی لیئے اُن کو مدعو نہیں کیا گیا۔ شیوجی اِس واقعے کو سُن کر غضب ناک ہوئے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے چبانے لگے۔ سر سے بالوں کی ایک لٹ اُکھاڑ کر پھینکی؛ جس سے ایک خوف ناک آواز نکلی۔ ساتھ ہی ایک مُہیب صورت نمایاں ہوئی۔ جس کا نام ویربھدر مشہور ہی۔ اِس کے ہزار سر تھے۔ ہزار آنکھیں تھیں۔ ہزار پاؤں تھے۔ ہزار ہتیار اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اُس کی شکل خوں خوار اور خوف ناک اور دہکتی آگ کی طرح روشن تھی۔ سر پر ایک ہلال نمایاں تھا۔ شیر کی کھال جو خون سے آلودہ تھی، اُس کے بدن میں تھی۔ شیوجی نے اُس کو حکم دیا کہ وہ دکش کے یگ کو خراب کر ڈالے۔ جب ویربھدر اپنی لاتعداد فوج لے کر چلا، تو زمین لرزنے لگی۔ پہاڑ آپس میں ٹکرا گئے۔ ہوا شور و غل سے بھر گئی۔ سمندر میں تلاطم پیدا ہوا۔ اُس نے یگ کو خراب کیا۔ دیوتاؤں میں سے جو اس یگ میں آئے تھے اندر کو زمین پر گرا دیا۔ یم کو زد و کوب کیا۔ سرستی اور ماتری کی ناک کاٹ لی۔ متر کی آنکھیں نکال لیں۔ پوشن کے دانت حلق میں اُتار دیئے۔ اگنی کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ بھارگو کی داڑھی مونڈ دی۔ چاند کے موُنھ پر ایک طمانچہ مارا۔ برہمنوں پر پتھر پھینکے۔ دکش کا سر کاٹ کر آگ میں جھونک دیا۔ یہ حالت دیکھ کر دیوتاؤں نے معافی مانگی اور التجائیں کیں۔ آخر کار اُن کی خطا معاف کی گئی اور اُن کے اعضا پھر درست کر دیئے گئے۔

منو وہ ہیں، جن سے نسلِ انسانی چلتی ہی۔ یہ تعداد میں چودہ ہیں۔ پہلا منو سوایم بھو تھا۔ برہما جی نے اپنے جسم کے دو حصے کیئے۔ اِن سے ایک مرد اور ایک عورت پیدا ہوئی۔ مرد وراج تھا اور عورت شت روپا۔ پھر اِن دونوں سے سوایم بھو پیدا ہوا۔ (دیکھو لفظ برہما) اِسی منو کی طرف منوسمرتی منسوب ہی۔ زمانۂ حال کی نسل ساتویں منو سے چلی ہی۔ اِس منو کا نام دئی وسوت ہی۔ متسیہ دیوتا نے اِسی کو طوفان کی خبر دی تھی۔ (دیکھو لفظ متسیہ) چھ منو اِس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ہر منو کی عمر (۴۳) لاکھ (۲۰) ہزار سال کی ہوتی ہی۔

شوی، ایک زاہد اور سخی راجہ تھا۔ ایک دفعہ اگنی دیوتا نے کبوتر کی صورت اختیار کی۔ اندر دیوتا نے باز بن کر اُس کا تعاقب کیا۔ کبوتر نے اس راجہ کی گود میں پناہ لی۔ باز نے راجہ سے کبوتر کا مطالبہ کیا۔ اُس نے اپنے جسم سے گوشت کاٹ کر چاہا کہ اس کبوتر کے برابر تول کر دے؛ مگر کبوتر کا وزن زیادہ نکلا۔ اس نے پھر گوشت کاٹا؛ مگر وہ بھی وزن میں پورا نہ اُترا۔ مجبوراً اپنا سارا جسم کبوتر کے مقابل ترازو میں [illegible]

پلّے برابر ہو گئے اور باز اُڑ گیا۔

ورآدھ یہ ایک مُہیب آدم خور راچھس تھا۔ ونڈک کے جنگل میں اُس نے سری رام چندر جی کا مقابلہ کیا۔ اس کے جسم پر کوئی وار کارگر نہ ہوتا تھا۔ پہاڑ جیسا قد تھا۔ آنکھیں کھوکھلی تھیں۔ موہنہ حد سے زیادہ چوڑا تھا۔ پیٹ اُبھرا ہوا تھا۔ جسم لمبا اور شکل ہیبت ناک تھی۔ شیر کی خون آلودہ کھال اُس کی پوشاک تھی۔ آواز میں گرج تھی۔ نیزہ ہاتھ میں تھا۔ شیر، چیتے، بھیڑیے اور ہاتھی کے سر لٹکائے ہوئے تھا۔ سری رام چندر جی نے تیر مارا، تو کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس نے سری رام چندر جی اور لچھمن جی کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ اُنھوں نے اُس کے بازو توڑ ڈالے۔ گھونسوں سے خبر لی، مگر اُسے قتل نہ کر سکے۔ مجبوراً ایک گڑھا کھود کر اُسے زندہ در گور کرا دیا۔

لوپا مدرا رشی اگست کی نہایت حسین بیوی تھی۔ جب رشی مذکور نے چاہا کہ اپنی مرضی کے مطابق کسی عورت سے شادی کرے، تو اُس نے مختلف حیوانات کے خوب صورت اعضا کو ترکیب دے کر ایک نہایت حسین لڑکی بنائی اور پوشیدہ طور پر ایک راجہ کے محل میں ڈلوا دی وہاں راجہ کی لڑکی سمجھی گئی اور شہزادیوں کی طرح اِس کی پرورش کی گئی۔ جب وہ جوان ہوئی، تو رشی اگست نے راجہ سے شادی کی درخواست کی۔ راجہ کا دل نہیں چاہتا تھا؛ مگر رشی کا سوال رد کرنا گناہ تھا۔ چنانچہ اُس نے رشی سے لوپا مدرا کی شادی کر دی۔

نل، دمن۔ نل عاشق اور دمن اُس کی معشوقہ تھی۔ دونوں کا قصہ مشہور ہے۔ فیضی نے فارسی میں اس قصہ کو ایک مثنوی میں نہایت فصاحت سے بیان کیا ہے۔ دمن راجہ بھیم والیِ برار کی لڑکی تھی۔ نل دوسری ریاست کا راجہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ذکر سُن کر باہم عشق کرنے لگے۔ دمن نہایت حسین تھی۔ نل بہادر، حسین، نیک مزاج شہ سواری اور سپہ گری کا ماہر تھا، ساتھ ہی قمار بازی کی لت بھی تھی۔ راجہ بھیم نے دمن کی شادی کے لیے سویمبر کی تیاری کی۔ امیدواروں میں نل بھی تھا۔ نل کے علاوہ چار دیوتا یعنی اگنی، اندر، ورن اور یم بھی امیدوار تھے اگرچہ دیوتاؤں نے نل ہی جیسی شکل بنا لی تھی؛ مگر دمن نے اپنے مطلوب کو پہچان لیا اور اُسی کا انتخاب کیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ راجہ نل کا ایک بھائی پشکر تھا، جو اُس سے دل میں حسد رکھتا تھا۔ اس نے نل کے ساتھ جوا کھیلنے کی طرح ڈالی۔ پشکر کھیل میں فریب کر کے اُس پر غالب آ گیا۔ نل کو اُس بازی میں سب کچھ ہار دینا پڑا۔ اب تمام مُلک پشکر کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اعلان کر دیا کہ میری رعایا میں سے کوئی نل اور دمن کو کسی قسم کی مدد نہ دے۔

ایک عرصے تک دونوں مصیبت زدہ جنگلوں میں پھرتے رہے۔ آخرکار نل نے اس خیال سے کہ دمن تکلیف نہ اٹھائے اور اپنے گھر چلی جائے، ایک دن سونے کی حالت میں اُسے چھوڑ کر آگے کی طرف کوچ کر دیا۔ دمن اپنے گھر نہیں گئی ملک چیدی کے شہزادے کے ہاں پناہ گزیں ہوئی؛ مگر اُس کو دمن کا حال معلوم ہو گیا۔ اُس نے اُس کے باپ کے گھر بھجوا دیا۔ نل کو ایک سانپ نے کاٹا۔ موت تو نہیں آئی؛ مگر شکل بالکل بدل گئی۔ وہ بہت بدصورت اور کوتاہ قد ہو گیا۔ شدہ شدہ وہ راجہ رتوپرن والی اجودھیا کے ہاں ملازم ہو گیا۔ دمن کے باپ نے ہر چند نل کی جستجو کرائی؛ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک برہمن نے خبر دی کہ نل زندہ ہے اور کسی جگہ موجود ہے۔ اُس نے برہمن کا جھوٹ یا سچ معلوم کرنے کے لیئے دوسری دفعہ سویمبر کی تیاری کی۔ راجہ رتوپرن سویمبر میں شریک ہوا۔ نل اُس کا رتھبان تھا۔ دمن نے اُسے کچھ کچھ پہچانا؛ مگر یقین نہیں ہوا۔ جب اُس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا دمن نے کھایا، تو فوراً اپنے شوہر کو پہچان لیا۔ دونوں باہم ملے۔ دیوتاؤں کی مدد سے نل اپنی اصلی صورت پر آیا۔ پھر اُس نے اپنے بھائی پشکر سے چوسر کھیلنے کی تیاری کی۔ اِس دفعہ وہ بازی جیت گیا۔ اپنی سلطنت واپس حاصل کی؛ بلکہ پشکر کی بیوی بھی جیت لی؛ مگر نل نے اُس کو معاف کر دیا اور کوئی ایذا نہیں پہنچائی۔

خاتمۂ مضمون ہندو ادبیات سے بطور مثال کے جو تلمیحات ہم نے اخذ کی ہیں اُن کا اس قدر بیان غالباً کافی ہوگا؛ مگر جس ہندو ذخیرہ کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں، اگر اُس کو ہمارے شاعر اور ہمارے انشا پرداز غور کی نظر سے مطالعہ کرینگے، تو اُن کو اس ذخیرہ سے بہت سی دلچسپ تلمیحات مل سکینگی۔ اسی طرح جس اسلامی اور غیر اسلامی ذخیرہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اگر اُن سے بھی کام لیا گیا، تو ادائے خیالات کے بہت سے نئے سانچے ہاتھ آئینگے۔ آخر میں ہم دو باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ کو خصوصیت کے ساتھ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

(پہلی بات) تو وہی ہے، جس کو ہم شروع مضمون میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی "انسانی زندگی، انسانی اخلاق اور انسانی معاشرت کے اس قدر پہلو ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ہر پہلو کے لیئے ایک نمونہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فلاں انسان اِس قسم کی زندگی بسر کرتا ہے۔ فلاں آدمی میں اِس قسم کے اخلاق موجود ہیں؛ مگر یہ ضرور نہیں کہ ہماری گزشتہ تاریخ میں بھی کوئی ایسا نمونہ موجود ہو"۔ اِس لیئے ضروری ہے کہ یا تو

(۱) ہم ایک خاص نمونے کے انسان کی صحیح تصویر قصے کے پیرایہ میں کھینچیں۔ پھر دیگر مصنفین جب اس نمونے کے شخص کا ذکر کریں، تو اس قصے کے نمونے کو تلمیح بنا کر اُس سے کام لیں۔ یا (۲) اگر ہماری زبان کے مشہور قصوں میں کسی خاص نمونے کے انسان کا ذکر کیا گیا ہی، تو اس نمونے کو تلمیح کا لباس پہنا دیں۔ یا (۳) اگر اُن قوموں کی تاریخ دیومالا اور ادبیات میں (جو ہمارے گردوپیش آباد ہیں اور جن سے رات دن ہمارا سابقہ ہی مثلاً ہندو، سِکھ، پارسی، عیسائی وغیرہ) خاص خاص نمونوں کے اشخاص کی تصویریں دیکھنے میں آئیں، تو اِن نمونوں کو بے تکلف تلمیح بنا لیں۔

(دوسری بات) یہ ہی کہ تلمیح کی بنیاد اکثر مشہورات پر ہوتی ہی، نہ کہ حقائق پر۔ اِس لیے جن باتوں سے تلمیح اخذ کی جاتی ہی، اُن پر یہ اعتراض کرنا سراسر حماقت ہی کہ ان باتوں کا ثبوت عقلاً یا نقلاً نہیں ہوتا۔ جب ہر تلمیح کسی خیال کے ادا کرنے کا ایک سانچہ ہی اور یہ سانچہ اس لیے کام میں لایا جاتا ہی کہ اس خیال کی تصویر سننے والوں کی نظر کے سامنے آجائے، تو ضروری ہی کہ تلمیح کی بنیاد جس بات پر رکھی جائے وہ لوگوں میں مشہور ہو۔ اِس بات کی ہم کو مطلق پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ اصلی اور واقعی بات کیا ہی۔ کیوں کہ جو بات اصلی اور واقعی ہی اور جو عام لوگوں میں مشہور نہیں ہی اور جو صرف محققین کے دماغ میں ہی، اگر ہم اپنے خیال کے چہرے پر اُس کا نقاب ڈالینگے، تو اس نقاب سے اُس کا حُسن دوبالا نہیں ہوگا؛ بلکہ ماند پڑ جائیگا اور جو غرض تلمیح سے ہی، وہ بالکل فوت جائیگی۔ مثلاً سوریہ یعنی سورج کو عام ہندو ایک دیوتا مانتے ہیں۔ اُن کے ادبیات میں یہ بات بیان کی جاتی ہی کہ اس دیوتا کے رتھ کے آگے سات گھوڑے جتے جاتے ہیں۔ بس اسی خیال پر تلمیح کی بنیاد رکھنی چاہیئے۔ ایک زیرک طبع تعلیم یافتہ ہندو کہہ سکتا ہی کہ سورج کے رتھ میں سات گھوڑوں کا جوتا جانا محض ڈھکوسلا ہی۔ اصلی بات یہ ہی کہ سورج کی شعاع سات رنگوں سے مرکب ہی اس سے ثابت ہوتا ہی کہ یورپ نے سائنس کی اِس قدر ترقی کے بعد جس حقیقت کا سُراغ لگایا ہی، ہمارے بزرگوں کی نظر اُس پر ہزاروں سال پہلے پڑ چکی ہی۔ ممکن ہی کہ اس تعلیم یافتہ ہندو کا یہ خیال درست ہو؛ مگر جو شاعر اور انشا پرداز اس تلمیح سے کام لینا چاہتا ہی اُس کو اس موشگافی کی مطلق ضرورت نہیں ہی۔ وہ اِسی عام اور مشہور خیال کو تلمیح کا لباس پہنانا پسند کریگا۔ اُمید ہی کہ ہمارے شاعروں اور انشا پردازوں کے لیئے یہ اشارہ کافی ہوگا۔

وحید الدین سلیم

یاسمین

از

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

پہلی نظر اور پہلا اثر سب سے عزیز اور بے بہا چیز ہی۔ اِس کا قائم رکھنا اور اُسے مناسب الفاظ میں صحیح
طور سے ادا کرنا انشا پردازی یا شاعری کی جان ہی۔

شام کا سماں ہی۔ چمن میں موتیے کا پھولوں بھرا پودا اپنی بہار دکھا رہا
اپنی سہانی روشنی سے اِس پُرلطف منظر میں عجیب کیفیت پیدا کر
اُس پودے پر پڑتی ہی۔ اُس سے جو اثر اُس پر ہوتا ہی اور جو
ہوتے ہیں۔ انہیں وہ ذیل کے چند اشعار میں نہایت

تیرہ فامی شام کی اور باغ کا سبزہ اُدا
چاندنی میں چاند کی خنکی بھی تھی

چشم و دل ظلمات ہیں اے پھول اُٹھ
بانٹ دے اپنا اُجالا آج

ہندی شاعری

(۱)

(از جناب پنڈت جنیشور پرشاد صاحب مائل دہلوی)

آج اڈیٹر صاحب اُردو کی فرمایش سے میں اپنے دوستوں کو ہندی کے چمن طرازوں کی طرزِ چمن طرازی دکھاؤں گا۔ خدا میری کوشش میں مجھے کامیاب کرے۔

ہندی کے باغبانوں نے اپنے اپنے دَوَر اور اپنی اپنی روشوں میں کیسے کیسے خوش رنگ خوش وضع اور خوشبودار پھولوں کے تختے سجائے ہیں۔ واللہ یہ امر بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

اگرچہ ہندی اور اُردو دونوں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں۔ مگر دونوں کے حُسن و ادا میں مغرب و مشرق کا بُعد ہے۔ ایک بھولی بھالی۔ سیدھی سادی۔ اپنے[1] پیارے پریتم یا پتی کے سچے پریم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تو دوسری بلا کی شوخ و شنگ اور عیار و طرار ہونے کے[2] علاوہ خود اپنے غرورِ حسن سے مست و سرشار ہے۔ ایک عاشق مزاج اور دوسری معشوق صفت مگر ہیں دونوں چربانک اور چرب زبان۔ جب رزم اور بزم کی

---

[1] مدعا یہ ہے کہ ہندی شاعری کا معشوق خود عاشق بنکر اپنے عاشق کے ہجر میں بیچین و مضطرب نظر آتا ہے۔ سَوت یا رقیب کا رونا اُس میں نہیں ہے۔ اور جہاں سَوت کا جلاپا پایا جاتا ہے وہ شاعری ادنیٰ اور ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ بیان میں فصاحت۔ بلاغت۔ موزونیت اور شوکتِ لفظی کے ساتھ سادگی سنجیدگی اور لطافت پائی جاتی ہے[2] بخلاف اس کے اُردو شاعری کا معشوق پُورا ہرجائی اور پکا عہد شکن ہوتا ہے۔ عاشق کو معشوق کے ظلم و جور کی شکایت کے ساتھ قدم قدم پر رقیب کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ بیان میں اور جُملہ خوبیوں کے ساتھ نہایت خوشنما شوخی۔ طراری اور جذبات کی گہری تاثیر پائی جاتی ہے۔ اور ایسی زبان ہمیشہ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ قوموں کے میل جول سے اَدلتی بَدلتی رہتی ہے۔ جیسے آج کل اُردو اور ہندی

داستانیں سُناتی ہیں تو سُننے والوں کو ہنسا کر یا رُلا کر ہی چھوڑتی ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہی کہ ابھی علمی مطالب کے ادا کرنے میں کم و بیش دونوں قاصر ہیں۔

یہ مانا کہ دونوں کی پیدائش کا وقت اور زمانہ بالکل ایک ہی۔ مگر تعلیم اور پرورش علحدہ علحدہ ہوئی ہی ہندی کو اس کی ماں پراکرت[1] اور خالہ سنسکرت[2] نے اپنا دودھ پلا کر پالا ہے۔ اور اُردو کو عربی فارسی کی دایہ نے اپنی چھاتی سے لگا کر پروان چڑھایا ہی۔ اس لئے اُردو میں شوخی۔ طرّاری فصاحت۔ بلاغت۔ شجاعت اور جرّاری کے ساتھ اگر کافی شیرینی اور کسی قدر متانت بھی پائی جاتی ہے تو یہ اُس دایہ کے دودھ کا اثر ہی۔ اور ہندی میں اگر بیحد سادگی۔ سنجیدگی متانت۔ شانتی[3]۔ اور بھولے پن کے پہلو بہ پہلو کسی قدر شجاعت۔ بہادری بناؤ سنگار۔ رسیلا اور چٹکیلا پن بھی موجود ہی۔ تو یہ اُس نے اپنی ماں اور خالہ سے جائز طور پر ورثتاً حاصل کیا ہی۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں ہی۔

میرے دوستو! یہ ان دونوں زبانوں کی وہ دو خاص ادائیں ہیں جن سے ان کی صورت۔ سیرت اور طرز و انداز میں ایک عجیب فرق اور غیریت پیدا ہوگئی ہی۔ ورنہ دراصل ذات۔ نسل اور خون دونوں کا ایک ہی۔ کیوں کہ آخر تو ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ ہاں صرف تعلیم و تربیت مختلف ہی اور اسی اختلاف نے دونوں کو دو جُدا جُدا سانچوں میں ڈھال کر رکھدیا ہی۔

جس گروہ نے ہندی کو اپنا بنایا اُس میں بھی ہندو اور مُسلمان دونوں قومیں پہلو بہ پہلو شاطہ گری

---

[1] یعنی وہ زبان جو ہندوستان میں فطرتاً بولی اور سمجھی جاتی ہی۔ جسے بچّے اپنے والدین سے خود بخود دیکھ لیتے تھے [2] مگر سنسکرت ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ساں اور اٹل رہتی ہی۔ کیوں کہ سنسکرت اُسے کہتے ہیں جسے وقت کی موجودہ پراکرت سے ہر عہد کے عُلما الفاظ کو صرف و نحو اور قواعد کے سانچے میں ڈھال کر اپنے ڈھنگ اور مطلب کا بنا لیتے ہیں۔ لہذا اُس کی صورت اور رنگ روپ میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اگرچہ الفاظ اُس میں بھی ہمیشہ نئے نئے شامل ہوتے رہتے ہیں اور زبان کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہی۔ مگر بیاکرن یعنی صرف و نحو چوں کہ وہی قدیم اور مقررہ ہیں اس لئے اُن کے اثر سے اُس میں جو لفظ نیا شامل ہوتا ہے وہ کچھ ایسا اپنا رنگ اور دَور بدل کر ملتا ہی کہ دیکھنے والوں کو بالکل اسی نسل کا بچّہ معلوم ہوتا ہی اور پھر کثرت استعمال سے اُسی کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص بلا سنسکرت کا بیاکرن پڑھے سنسکرت بولنا تو درکنار سمجھ بھی نہیں سکتا [3] یعنی سکون اور اطمینان۔

کرتی رہیں۔ اور جو گروہ اُردو کا دعوی دار بنا اُس میں بھی۔ جیسا کہ دونوں زبانوں کی تاریخ اور تذکروں سے ثابت ہے۔ بلکہ آج بھی خدا کے فضل سے دونوں جانب جیتے جاگتے ہنستے کھیلتے نمونے اور ثبوت موجود ہیں ہاں کثرت اور قلت کی بات دوسری ہے۔

میں جب مادرِ ہند کے دو فرزندوں کو آپس میں فقط اس امر پر لڑتے جھگڑتے اور بحث کرتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ ایک کہتا ہے "میری ہندی" اور دوسرا کہتا ہے "میری اُردو" تو مجھے سخت تعجب ہوتا ہے۔ واللہ میں دونوں کو جھوٹا اور کاذب جانتا ہوں۔ بلکہ معاف کیجئے گا غاصب بھی کیوں کہ میں دیکھتا ہوں صریح ایک دوسرے کا ورثہ اور حصّہ بالکل زبردستی ناجائز طور سے تلف اور غصب کر رہا ہے۔ مگر نہ دل شرماتا ہے نہ آنکھ جھپتی ہے۔ مجھے شرمناک حرکت پر اکثر غصہ آتا ہے۔ مگر دل ہی دل میں جلتا ہوں اور مارِ دُم بُریدہ کی طرح پیچ و تاب کھا کر بیٹھ رہتا ہوں بقول شخصے ع قہر درویش بجانِ درویش۔

تاہم میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ حماقت آمیز ظلم دونوں زبانوں کو یکساں نقصان پہنچا رہا ہے۔

میرے دوستو! میں ہندو بھی ہوں اور مسلمان بھی۔ کیوں کہ ہندو ہندی کے مالک بنتے ہیں اور مسلمان اُردو کے۔ اس پر ایک کو دوسرے کی رائے اور پسند سے گریز اور نفرت بھی ہے۔ مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے دونوں زبانوں سے برابر کی محبت ہے۔ میری نظر دونوں کے حسن و قبح پر یکساں جمی ہوئی ہے۔ میں دونوں میں ایک ایسی دلچسپی اور دل لبھانے والی آواز دیکھتا ہوں کہ مجھے یہ بھی محبوب و مطلوب نظر آتی ہے اور وہ بھی۔ میں کسی سے بھی اپنی محبت کم نہیں کر سکتا۔ مجھے آدھا ہندو اور آدھا مسلمان یا مردودِ فریقین بننا منظور مگر میں اُردو کو نظر انداز کر دوں، یا ہندی سے ترک محبت کر لوں یہ قطعی نامنظور ہے۔

کسی کے نزدیک ہندوستان کی ملکی زبان اُردو ہو یا ہندی مگر میرے نزدیک یہ دونوں خالص میری اور اسی ملک کی زبانیں ہیں۔ قدرت نے جہاں مجھے پیدا کیا ہے وہیں ان دونوں زبانوں کو جنم دیا ہے۔ اور چونکہ یہ مجھ سے بہت پہلے پیدا ہوئیں ہیں اس لئے مجھ پر ان کا بزرگانہ حق بھی ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ میں کس کا حق فراموش بنجاؤں، کس کو یاد رکھوں اور کسے بھلا دوں۔

دونوں بہنیں بڑھی چڑھی ہیں۔ بیہر ترتیب پائی۔ اتالیق ہندو اور مسلمان دونوں رہے۔ آج ان دونوں

زبانوں کے طرز و انداز میں جو دلکشی اور دلربائی نظر آتی ہے۔ دونوں قوموں کی مشترکہ محنتِ عرقریز کا نتیجہ ہے جس سے کوئی عقلِ سلیم رکھنے والا ہندو یا مسلمان انکار نہیں کرسکتا۔ لہٰذا کوئی لڑے یا جھگڑے۔ مگر جس کی مٹی جہاں کی ہے وہیں کی رہے گی اور وہیں کی سمجھی جائے گی بدل نہیں سکتی۔

اور مزہ یہ ہے کہ دلّی۔ لکھنؤ اور پنجاب کو چھوڑ کر تمام ہندوستان میں دونوں زبانیں آج بھی بلاتکلّف بولی جاتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں بولتے سمجھتے ہیں۔ البتہ مسلمان ہندی میں اور ہندو اُردو میں خصوصیت کے ساتھ قابلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے نزدیک یہ دونوں قوموں کی سخت غلطی ہے اور یہ غلطی نہ صرف ان دونوں زبانوں کے لئے بلکہ اس ملک کی علمی۔ اخلاقی۔ تمدّنی اور حقیقی زندگی کے لئے بھی ایک مہلک اور وبائی مرض سے کم نہیں ہے۔ کیوں کہ ہندوؤں کا لٹریچر ہندی میں زیادہ ہے اور مسلمانوں کا اُردو میں۔ لہٰذا جب تک دونوں زبانوں میں یکساں اور کافی مہارت نہ پیدا کیجائے گی ایک کا دوسرے کو صحیح طور سے سمجھ لینا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ آزاد اور قومی درسگاہوں میں خواہ وہ ہندوؤں کی ہوں یا مسلمانوں کی ہندی اور اُردو کی تعلیم ساتھ ساتھ دی جائے۔ اور دونوں کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ ہندو اُردو کے ناز اُٹھائیں اور مسلمان ہندی کے چاؤ چونچلوں سے اپنا جی بہلائیں دونوں بلاتکلف آپس میں تبادلۂ خیالات کرسکیں۔ ایک دوسرے کو سمجھے، جانے، پہچانے تاکہ آپس کی مُغایرت گھٹے اور محبّت سوا ہو۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا ایک کی نظر میں دوسرے کی حقیقی اور واجبی عزّت پیدا نہیں ہوگی۔

یہ اَمر مُسلّمہ ہے کہ جس دل میں اپنے رفیق یا ہمسایہ کی عزت نہیں ہے۔ اُس کی محبّت اور الفت بھی نہیں ہے اور بلا محبّت کے ایک گھر میں دو بھائیوں کا یا ایک ملک میں، دو قوموں کا آپس میں مل جُلکر رہنا یا اَمن و اطمینان کی زندگی بسر کرنا بالکل ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ نور و ظلمت اور آب و آتش کا ایک وقت اور ایک ہی جگہ جمع ہو جانا۔

"اُردو کے ناظرین حسنِ اُردو کا جلوہ تو ہمیشہ بے محابا اور [illegible] آنکھ سے دیکھتے ہیں اس لئے اُس کی تعریف وتوصیف میں کاغذ سیاہ کرنا بے سود ہے۔ البتہ ہندی اُر[illegible] ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آج

اُس کا بھی ایک گوشۂ نقاب اُٹھا کر حُسن گلو سوز کی یونہی سی جھلک دکھادوں تاکہ اربابِ فہم اُس کی حلاوت اور چاشنی سے بھی بے خبر نہ رہیں۔

میں اس مختصر تحریر میں صرف چھ شاعروں کا تذکرہ پیش کروں گا جن میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے باکمال سخنور کندھے سے کندھا ملائے ہندی کی خدمت کرتے ہوئے نظر آئیں گے جو اپنے نمونہ سے ہمیں اخلاق اور بے تعصّبی کا سبق دے کر آیندہ کے لئے ہماری زندگی کا دستور العمل یا طرز معاشرت سمجھائیں گے میں نے جن شعراء کو اپنے نزدیک قابل ذکر سمجھا ہے اُن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

	پُورا نام	اور	تخلّص
۱ ۔	ملک الشعراء یا مہاکوئ پنڈت بہاری لال۔		بہاری
۲ ۔	مہاتما شری سُور داس جی		سُور یا سُور داس
۳ ۔	خان خاناں عبدالرحیم خاں		رحیم یا رحمٰن
۴ ۔	سید مبارک علی بلگرامی		مبارک
۵ ۔	مہاتما پنڈت بنارسی داس جی		بنارسی
۶ ۔	پنڈت دولت رام جی		دَول یا دولت

پنڈت بہاری لال بہاریؔ

یہ ہندی شاعری کا سرتاج ککّو رخاندان میں ایک "ماتھر" برہمن کے گھر بُوا گو بند پور ضلع گوالیار میں پیدا ہُوا تھا۔ سنِ تولّد ۱۶۶۰ وکرمی یا ۱۶۰۳ عیسوی کہا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں اس کا بچپن بُندیل کھنڈ میں اور جوانی تمام وکمال متھرا بندرابن میں گزری ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جنھیں ہندی یا برج بھاشا کی ٹکسال کہنا چاہیئے۔ لہٰذا اس باکمال شاعر کو ہندی کے اہلِ زبان ہونے کا پُورا پُورا فخر حاصل ہے۔

یہ زمانہ اَورنگ زیب کا زمانہ تھا اور بہاری لال میرزا مہاراجہ جے سنگھ سوائی والیِ جے پُور کے مدّاح تھے۔ اس لئے ان کی باقی تمام عمر اُسی دربار میں بسر ہوئی۔ دربار کی قدر دانیوں نے ان کی خوب

خوب حوصلہ افزائی کی۔ علاوہ پیٹے اور تنخواہ کے فی دوہا ایک اشرفی کا انعام مقرر تھا۔ لہٰذا میرزا مہاراجہ کے سایہ میں رہکران کی شاعری کا گلدستہ کچھ ایسا سجا اور ایسا مہکا کہ اُس وقت سے لے کر آج تک ہر دَور میں صدہا سخن سنج بھَونرے اُسی کی خوشبو کے متوالے رہے اور آج تک ہیں۔

شاید مہاراج سَوائی جے سنگھ دوہوں کے بڑے قدردان تھے۔ اس لئے اس کی شاعری میں صرف دوہے ہی دوہے ملتے ہیں۔ ممکن ہی کہ انھوں نے اور بحروں میں بھی بہت کچھ لکھا ہو۔ مگر افسوس ان کا باقی کلام آج کل دستیاب نہیں ہے۔ اور وہ دوہے بھی بہت تھوڑے کُل ۷۱۹ ہیں جو ایک کتاب کی صورت میں چھپے ہوئے ہیں اور بہاری "ست سئی" सतसई کے نام سے مشہور ہیں۔ اتنے بڑے شاعر کا اتنا تھوڑا کلام ہو نہیں سکتا۔ مگر خدا جانے اُس کے دوسرے بے بہا لالوں کو زمانے کی دست بُرد نے قدردانوں کی نگاہ سے چھپا کر کہاں کا کہاں پہنچا دیا۔

شکر ہی کہ وہ ۷۱۹ دوہے بھی ۷۱۹ گوہر نایاب ہیں جن کے آگے بڑے بڑے جوہریانِ سخن کی دوکانوں کے جواہرات بالکل مدھم اور بے آب نظر آتے ہیں۔ ان دوہوں پر تقریباً ۴۰ ہندی شعرا نے بڑی بڑی ضخیم ٹیکائیں[1] لکھی ہیں اور اکثر نے ان کے مضامین چُرا چُرا کر اپنی جداجد شاعری کی ہی مگر

ع حق تو یوں ہی کہ حق ادا نہ ہوا

ایک دفعہ میرزا مہاراجہ جے سنگھ ایک کم سن رانی یا گلِ نارسیدہ کے پریم میں ایسے پھنسے کہ محل سے برآمد ہونا اور دربار میں آنا بالکل ترک کر دیا۔ مصاحبوں اور اہلکاروں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ تب بہاری نے ایک دوہا لکھکر کسی حکمت عملی سے مہاراج کے پاس پہنچایا۔ کہا جاتا ہی کہ اُسی روز مہاراج محل سے برآمد ہوئے۔ دربار کیا۔ اور بہاری لال کو خلعت فاخرہ کے علاوہ عہدہ اور منصب بھی عطا فرمایا۔ وہ دوہا یہ ہی۔

दोहा

नहिं पराग नहिं मधुर मधु, नहि विकास इंह काल
अली कली ही सौं बँध्यो, आगे कौन हवाल ॥

---

[1] ٹیکا شرح کو کہتے ہیں

نہیں پراگ ۔ نہیں مَدھر مَدھو ۔ نہیں بکاس اہنیہ کال

دوہا آلی کلی ہی تیں بندھیو آگے کون حوال

شاعر کہتا ہی۔ ”ابھی اُس میں نہ تو زرِ گُل یعنی وہ ذرّے ہیں جو پھول میں سے نکل کر دُور تک لوگوں کے دماغوں کو معطّر کیا کرتے ہیں۔ نہ میٹھا شہد ہی اور نہ ابھی شگفتگی ہے۔ بھونرا صرف کلی یا غنچہ ناشگفتہ ہی میں اُلجھکر رہ گیا ہی نہ جانے آگے چل کر اس کا کیا حال ہوگا۔“

اہا ہا بہاری نے اپنے بھونرے کی خیر خواہی کا کتنے اچھے لفظوں میں ثبوت دیا ہے۔ کیسی گہری دُور اندیشی ہی۔ کتنے میٹھے اور خوشگوار الفاظ میں نصیحت کا امرت پلایا ہے کہ داد نہیں دی جاسکتی ایک ذی مرتبہ شخص اپنی حیات کی لذّت میں اندھا ہوکر محو ہوگیا ہے اور اُس محویت سے آیندہ یقینی طور پر جو ناگوار نتیجہ پیدا ہونے والا ہی اُس سے خائف ہوکر ایک خیر خواہ دوست اُسے نصیحت کرنا چاہتا ہی مگر ساتھ ہی ڈرتا بھی ہے کہ کہیں میرے الفاظ سے میرے دوست کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اُس کے لئے اِس سے اچھا اسلوب پیدا نہیں ہوسکتا۔ بہاری کہتا ہی۔

दोहा बाम बाँह फरकत मिलैं, जो हीर जीवन मूरि।
तौ तोही सौं भेटिहौं, राखि दाहिनी दूरि॥

دوہا
بام بانْہ پھرکت ملیں جو ھیر جیوَن مُور
تو توہی سوں بھیٹ ہوں رَاکھ داہنی دُور

واضح ہو ”شگن شاستر“ یا علمِ شگون کی رُو سے مَرد کے دائیں اور عورت کے بائیں بازو کا پھڑکنا کسی بڑی خوشی یا مسرّت کا مژدہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ امرِ مسلّمہ ہی کہ ایک عاشق کے لئے اپنے معشوق سے بغلگیر وہم آغوش ہونے کے سوا اور کوئی مسرّت نہیں ہی۔ چنانچہ مذکورہ بالا دوہے کی موضوعہ یا ”ہیروائن“[1] کہتی ہے کہ

---

[1] ”ہیرو“ اور ”ہیروائن“ یہ دونوں انگریزی لفظ ہیں۔ ہندی میں ان کی جگہ ”نائک“ اور ”نائکہ“ بولا جاتا ہی۔ میں بھی انہی لفظوں سے کام لیتا مگر اُردو میں چونکہ ان الفاظ کا استعمال نہایت رکیک معانی میں کیا جاتا ہی۔ لہٰذا میں نے ان سے پرہیز کیا اور اُس کی بجٰئے موضوع اور موضوعہ استعمال کیا ہی۔ آیندہ بھی ایسا ہی کروں گا تاوقتیکہ کوئی اُن سے بہتر لفظ نہ ملے

اے بائیں بھجا[1] اگر آج تیرے پھڑکنے سے میری زندگی کے سبب اعلیٰ ہر بھگوان یعنی کرشن چندر مجھسے آ کر ملیں تو میں بغلگیر ہوتے وقت اپنی داہنی بھجا کو دُور رکھکر تجھ ہی کو آگے بڑھا دوں گی اور پہلے تجھ ہی سے بغلگیر ہوں گی۔

سُبحان اللہ کتنا پاک اور اچھوتا مضمون ہے شاعر نے شوق وصل کی کتنی بے لوث تصویر کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ چوں کہ عاشق عورت ذات ہی۔ لہٰذا اُس کی کمزور فطرت۔ اوہام پرستی۔ احسانمندی بھولا پن اور حق خدمت کے اظہار کا خیال کتنے اچھے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اُس پر طرّہ یہ کہ جیسی خدمت ویسا انعام۔ چوں کہ بائیں بازو نے پھڑک کر وصل معشوق کی خوشخبری سُنائی ہی اس لئے اُس خوشی کا سب سے بڑا حصّہ پہلے اسی کو انعام میں دینے کا وعدہ کیا جاتا ہی۔ ع

تو تو ہی سون بھیٹ ہوں راکھِ داہنی دُور

ان الفاظ میں کتنا اثر ہے اور کیسا دلکش جادو بھرا ہوا ہی۔ اسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ پھر کہتا ہے۔

दोहा

मृ-- नैनी दृग की फरक, उर उछाह तन फूल।
बिन ही पिय आगम उमँग, पलटन लगी दुकूल॥

دوہا

مِرگ نَینی دِرگ کی پھرک۔ اُر اُچھاہ تن پھُول
بِن ہی پیہہ آگم اُمنگ پلٹن لگی دُو کُول

اس دوہے میں بہاری نے اور بھی غضب کر دیا ہی۔ یہاں بھی وہی شگون کا مضمون ہی ظالم کہتا ہی۔ ہرن کی سی آنکھ رکھنے والی موضوعہ جو اپنے پیارے پتی کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اِک ذرا کی ذرا بائیں آنکھ پھڑکنے سے دل میں اتنی خوش ہوتی ہی کہ پھُولی نہیں سماتی اور اس شگون سے اُسے اپنے پریتم کی آمد کا اتنا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ جلدی اور گھبراہٹ میں آنکھ کو انعام دینے کا خیال بھی نہیں آتا۔ بلکہ خود ساڑھی بدلنے اور سنگار کرنے لگتی ہی۔

اس سے پہلے دوہے میں موضوعہ کو یقین نہیں ہوتا بلکہ شک رہتا ہی۔ اس لئے وہ کہتی ہی کہ اے بائیں "بھجا" اگر ایسا ہوا تو میں تجھے یہ انعام دوں گی۔ مگر یہاں وہ بات نہیں ہی۔ یہاں اتنا زبردست یقین ہی کہ خود محو تزئین د

---

[1] "بھجا" سنسکرت میں بازو کو کہتے ہیں چوں کہ بازو تذکیر ہے اور بھجا تانیث مجھے یہاں تانیث ہی کی ضرورت تھی لہٰذا مجبور بھجا ہی لکھنا پڑا

آرایش ہو جاتی ہے۔ اور گویا سمجھتی ہے کہ وہ آہی گئے۔

خاقانیٔ ہند حضرتِ ذوق علیہ الرحمۃ نے اسی مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے ادا کیا ہے وہ فرماتے ہیں

سُن کے آمد اُن کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

اس شعر میں معشوق کی آمد کی خبر سُن کر پیشوائی کو جانا اور دوہے میں محض اپنی ہی بائیں آنکھ کے پھڑکنے سے معشوق کی آمد کا یقین کامل ہو جانا۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ شعر کے خیال سے دوہے کا خیال نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ مگر دوہے کا یہ خیال کہ معشوق کی آمد کے یقین سے فقط محوِ آرایش و زیبائش ہو جانا ایک معمولی بات ہے۔ تاہم موضوعۂ کلام چوں کہ خود معشوق بمنزلۂ عاشق ہے لہذا اُس کے لئے نہایت موزوں ہے اور شعر کے متکلّم کا فقط لفظِ از خود رفتہ سے پیشوائی کو جانے کے معنی پیدا کرنا گویا شاعری کا کمال ہے۔ اور معشوق کی آمد پر جو عاشق کے دل میں فطرتاً ایک اضطراب پیدا ہوتا ہے اُس کا نہایت موزوں اور بیّن ثبوت ہے۔

ہندی کا ایک اور شاعر "توش ندہی" اسی مضمون پر ایک کبت لکھتا ہے۔ اُس میں گو یقین کے بجائے وہی انعام کا قصّہ ہے۔ مگر کبت چوں کہ دوہے کی نسبت سے ایک بہت بڑی بحر کا نام ہے۔ لہذا اُس میں مضمون اور الفاظ کے لئے کافی گنجایش ہے۔ اس لئے شاعر مذکور کو اپنے مضمون کے ادا کرنے کا بہت اچھا موقعہ ملا ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

कबित्त

पैंजनी गढाइ चोंच सोनेसढ़ाइ दैहों, कर परलाइ पर रुचि सों सुधोरहों।
कहै कवितोष छिन अटकन लैहो, कवौं कंचन कटोरे आटा खीर भारधारही
ऐर कारे काग तेरे शकुन सँजोग, आनमेरे पति आवैं तो बचनतेंन टार हो,
करती कराम तीन पहिले करूँगीरव, अपने पिया को फिर पीछे अंग भारहों

کبت

پینجنی گھڑا چونچ سونے سے منڈائی دیہوں۔ کر پر لائی پر رُچ سون سُدھر ہوں
کہے کوِی توش چھن اٹک نہ لیہوں۔ کبو کنچن کٹورے اٹا کھیر بھر دھر ہوں

اے رے کارے کاگ تیرے شگُن سنجوگ۔ آج میرے پتی آویں تو بچن تے نہ ٹھہروں
کرتی کرارتوں پہلے کروں گی سب۔ اپنے پیا کو پھر پیچھے انگ بھروں
چوں کہ علم شگون میں کوتے کا کسی خاص سمت میں بولنا بھی اپنے پیارے کی آمد کا مبارک شگون
سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا کبت کی موضوعہ کہتی ہے کہ میں تیرے لئے پینجنی[1] گھڑوا دوں گی۔ تری چونچ کو سونے
سے منڈھوا دوں گی۔ ہاتھ پر بٹھا کر نہایت پیار سے تیرے پروں کو سنواروں گی۔ تجھے کبھی ایک لمحہ
کے لئے بھی نہیں بھولوں گی۔ سونے کے کٹورے میں دودھ بھر کر تیرے لئے اٹاری پر رکھ دوں گی۔
اے کالے کوتے آج تیرے شگون کے مطابق اگر میرے پیارے پریتم آجائیں گے تو میں اقرار کرتی ہوں
کہ اپنے قول سے کبھی نہیں پھروں گی اور جب تک یہ تمام شرطیں پوری نہ کرلوں گی اپنے پتی سے بغلگیر
نہیں ہونے کی۔

اللہ رے بے قراری اور شوق مُلاقات۔ ایک مہجور عاشق جو عورت ذات ہے۔ اپنے پریتم یا معشوق کی
فرقت میں کتنی بیچین ہے۔ ایک انتہا کے ذلیل اور حقیر جانور سے کیسے کیسے اقرار کر رہی ہے۔ اور پھر اُس
اقرارنامے کی آخری شرط کتنی کڑی اور کیسی مشکل ہے کہ "میں اپنے معشوق سے ہم آغوش ہونے سے
پہلے تیری یہ تمام شرطیں پُوری کردوں گی"۔ واہ واہ واہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اُس پر طرہ
یہ کہ خیالات جو ایک عورت کی زبان سے اَدا ہو رہے ہیں وہ اُس کے لئے نہایت موزوں اور فطری واقع
ہوئے ہیں لہٰذا جس قدر داد دیجائے کم ہے۔ مگر بہاری نے اپنے دوہے کی بحر خفیف میں جو کچھ کہدیا ہے
وہ کمال کیا ہے۔ اور سُنئے :-

दोहा

फिर फिर चित उती रहत, टूटी लाज की लाव।
अंग अंग छाव भौर मैं, भयो भौंर की नाव॥

پھر پھر چت اُت ہی رہت۔ ٹوٹی لاج کی لاؤ
انگ انگ چھبی جھور میں بھیو بھَونر کی ناؤ

---

[1] جیسے شوقین لوگ اپنے پالتو کبوتروں کو پہناتے ہیں۔

کہتا ہی" دل ہر پھر کر اُدھر ہی جاتا ہی۔ وہیں رہتا ہے۔ شرم کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ معشوق کی ہر حصّہ جسم کی صفائی۔ خوشنمائی اور لطافت اُسے رہ رہ کر اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس کھینچا تانی سے دل بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کی مثال بنا ہوا ہی"۔

اہا ہا ہا "انگ انگ چھبی جھَوَر" کا بھنور کتنا موزوں اور خوبصورت بھنور ہے کاش میں آپ کو الفاظ کی لذت سے محظوظ کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

दोहा

सखी सिखाव मान विधि, सैनन वरजति बाल।
हरु ये कहि मो हिय वसत, सदाँ बिहारी लाल॥

دوہا

سکھی سکھاوت مان بِدھ سینن برجتِ بال
ہَرُو یہ کہہ موہیئے بست سداں بہاری لال

میری دوستو! اس دوہی کا جواب نہیں ہوسکتا۔ اِس کا مضمون بھی جہاں تک میرا خیال ہی بالکل نیا ہی۔ ایک بھولے بھالے کمسن معشوق کو اُس کی سکھی یا سہیلی اپنے عاشق سے ناز کرنا سکھا رہی ہی۔ عاشق کون ہے؟ دوہی کا مصنّف بہاری لال سکھی کیا سکھا رہی ہے؟ "مان بِدھ" یعنی انداز ناز۔ اور غرور کرنے کا طریقہ جس میں بگڑنا۔ رُوٹھنا۔ ضد کرنا۔ مچلنا اور جلانا۔ ترسانا وغیرہ وغیرہ سب شامل ہی اور یہ اتنا لمبا چوڑا مطلب صرف "سکھی سکھاوت مان بدھ" کے جملے میں بھرا ہوا ہی۔

چوں کہ سہیلی کی یہ تعلیم اپنے پیارے پریتم سے ایک قسم کی بغاوت کرنا سکھانا ہی اور بغاوت کی تعلیم میں اُستاد شاگرد دونوں کو یہ خوف رہتا ہی کہ ایسا نہو کوئی دیکھ لے سُن لے لہذا "سینن برجت بال" کا یہ مطلب ہی کہ وہ بھولی بھالی کمسن نازنین اُسے آنکھوں کے اشارے سے روکتی ہی۔ منع کرتی ہے اور کہتی ہی اری تو یہ کیا کہہ رہی ہے۔ خبردار وہ سُن لیں گے میرے دل میں ہمیشہ بہاری لال رہتی ہیں۔ واہ وا واہ۔

ع خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

اور مزہ یہ ہے کہ اس دوہے کا آخری جملہ "موہے بست سداں بہاری لال" اس غضب کا جملہ ہے کہ جس کی تعریف کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی جس پہلو سے دیکھئے اس کے ایک نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "بہاری لال" خود شاعر کا نام ہے اور معرفت کا اس میں چوچلا یہ ہے کہ "بہاری لال" بھگوان کرشن چندر کا بھی نام ہے۔ اور بہاری اُسے بھی کہتے ہیں جو ہر جگہ پھرنے والا پورا ہرجائی ہو۔ اب غور کیجئے کہ یہ تینوں معانی اپنی اپنی جگہ اس دوہے میں کیسا لطف دے رہے ہیں۔

"معشوق چوں کہ ہم طالب و ہم مطلوب ہے اُردو کے شاعروں کا سا بیوفا۔ ظالم اور قاتل معشوق نہیں ہے لہذا اُس کے دل میں اُس کے پیارے پریتم بہاری لال ہمیشہ بسے رہتے ہیں۔ وہ کم سنی اور بھولے بھالے پن کی وجہ سے عالم خیال کی موجودگی کو بالکل صحیح اور اصلی موجودگی سمجھتا ہے۔ اس صورت میں یہ ظاہر ہے کہ اُس کا ہر فعل بہاری لال ہی کا فعل سمجھا ہوگا اور جو بات اُس سے کہی جائے گی اُسے "بہاری لال" بھی ضرور ہی سُنیں گے۔ بات چوں کہ بغاوت کی ہے۔ اس لئے وہ اتنا ڈرتا ہے۔ اپنے دوست کو اور اپنے آپ کو عاشق کے عتاب سے بچانے کے لئے آنکھ کے اشارے سے منع کرتا ہے مُنہ سے بھی نہیں کہتا۔"

اگر بہاری لال کے معنی بھگوان کرشن چندر مانے جائیں تو جو دل اتنا پاک اور پوتر ہے کہ اس میں ہمیشہ بھگوان بسے رہتے ہیں۔ وہ اپنے پیارے پریتم کے خلاف بغاوت کا مشورہ سُننا کیوں کر پسند کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ آنکھ کے اشارے سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے خبردار یہ مت کہو میرے دل میں بھگوان بہاری لال بستے ہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

اور تیسرے معنی ہر جگہ پھرنے والے پورے ہرجائی کے لئے جائیں تو وہ کہتی ہے "دیوانی! جو شخص پورا ہرجائی تھا۔ جسے ۲۴ گھنٹے پھرنے کے سوا ایک لمحے بھی قرار نہیں تھا۔ وہ جب اپنی خلقی اور جبلی عادت چھوڑ کر ہمیشہ میرے دل میں رہتا ہے تو کیا ایسے شخص کے لئے مجھے یہ مناسب نہیں ہے کہ معشوق ہونے کی حیثیت سے جو غرور و ناز کرنا میری طبعی عادت ہے اُسے ترک کر دوں اور با وفا بنجاؤں؟

شاید بعض احباب کو یہ خیال ہوگا کہ یہ معنی زبردستی پہنائے جا رہے ہیں۔ مگر جو لوگ دوہے کے الفاظ پر عبور رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ معنی زبردستی نہیں پہنائے گئے ہیں بلکہ حقیقتاً پیدا ہوتے ہیں۔ کیوں کہ

دوہی کے مصرعۂ اُولیٰ کے معنی تو جوں کے توں قایم رہتے ہیں صرف مصرعۂ ثانی کے مطلب کی اول بدل پیدا ہوتی ہی۔ اور مصرعۂ ثانی کے الفاظ بہت مختصر ہیں اُن میں بھی "موہیئے بست سداں بہاری لال" کے جملے میں صرف بہاری لال کے معنی بدلتے ہیں۔ اور وہ بھی لغت کی اجازت سے خواہ مخواہ نہیں۔ "ہر دیہ کہہ" کا جملہ کچھ ایسا جامع جملہ ہے کہ جو سینکڑوں خیالات پر مبنی کیا جا سکتا ہے۔ بس یہی شاعری کا کمال ہی کہ سامع کا خیال جس طرف راغب ہو جائے شعر کے ایک خوبصورت اور دلکش معنی پیدا ہو کر سُننے والے کو محظوظ کر سکیں اور ایک شرح نگار اُس کی کئی کئی طرح سے شرح لکھ سکے۔ چنانچہ مجھ جیسا ہیچمیرز کج فہم بھی مذکور الصدر معانی کے علاوہ ایک اور نئے معنی پیدا کر سکتا ہے۔ سُنئیے وہ کہتی ہی:-

"اری تو یہ کیا کہہ رہی ہے نادان! جس دل میں ہمیشہ "بہاری لال" رہتے ہیں یعنی جس دل پر وہ اپنا دوامی قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ بھلا اُس میں تیرے تعلیم کئے ہوئے غرور و ناز کو جگہ ہی کہاں مل سکتی ہی۔ اری اُس میں تو ایک کے سوا دوسرے کی گنجایش ہی نہیں ہی"۔

چوں کہ دوہی کے مصرعۂ اولےٰ کا صرف یہ مطلب ہی کہ سہیلی "ناز کرنا سکھاتی ہے اور موضوعہ اُسے آنکھ کے اشارے سے منع کرتی ہی۔ روکتی ہے" دوسرے مصرعہ میں شاعر یہ مفہوم ظاہر کرتا ہی کہ وہ اس لئے روکتی ہے کہ "میرے دل میں ہمیشہ بہاری لال رہتے ہیں تو ایسا نہ کہہ" مگر بہاری لال رہتے ہیں تو اس سے کیا ہرج ہوتا ہی اور وہ ایسا کیوں نہ کہے۔ یہ اُس میں کچھ نہیں ہے۔ بلکہ اُن لفظوں میں یہ خیال مقدر یا تقدیری ہے۔ اور بہاری لال ایک ایسا لفظ ہے جس کے ایک سے زیادہ معنی بھی ہو سکتے ہیں لہذا شارح بالکل آزاد ہی۔ اُسے اختیار ہی کہ وہ اپنی قابلیت سے جس قدر معنی چاہی پیدا کر سکتا ہے۔

تیرِ نظر کے مضمون کو ہمارے اُردو شعرا نے بکثرت نظم کیا ہی۔ جہاں تک میرا خیال ہے شاید ایک ہزار میں ایسا ایک شاعر بھی مشکل نکلے گا جس نے اس مضمون پر صدہا پہلو سے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ مگر ہماری بہاری کے تیرِ نظر کا انداز سب سے نرالا ہی سُنئیے:-

दोहा तिय कित कमनैती पढ़ी, बिन जिह भौंह कमान ।
चल चित वेधे चुकति नहिं, वंक विलन वान ॥

رتیہ کِت کنیمتی پڑھی ۔ بن جس بھو نہ کمان
دوہا
چل چت بیدھے چکت نہیں ۔ بنک بلوکن بان

اس دوہی کا ترجمہ کرنے سے پہلے اس کے دو لفظوں کی تشریح کر دینا نہایت ضروری ہے ایک "رتیہ" (तिय) اور دوسرا "چل چت" (चलाचित) رتیہ کے معنی ہیں "ابلا" یعنی کمزور عورت یا نازک معشوق اور "چل چت" ایک مرکب جملہ ہی جو چل اور چت دو لفظوں سے بنا ہی۔ جس میں "چل" کے معنی ہیں متحرک بیقرار۔ اور "چت" کے معنی ہیں من یا دل لہذا "چل چت" کے معنی ہوئے دلِ بیقرار یا دلِ مضطر۔

شاعر کہتا ہی اے نازک معشوق تو نے یہ فن تیر اندازی کہاں سیکھا؟ کیوں کہ تیری بھوں جو کماں ہے اُس میں تو زِہ[1] نہیں ہی۔ بغیر چلّے کی ہی اور جسے تو نشانہ بنانا چاہتا ہی۔ وہ دلِ بیقرار ہے۔ اُسے کسی پہلو قرار ہی نہیں ہی۔ یہاں بیقراری دو معنی پر دلالت کرتی ہی۔ ایک تو عاشق کا دل ہے اس لئے بیقرار ہے اور ایک دل بالخاصہ بیقرار ہوتا ہے۔ لہذا جو شے متحرک اور بیقرار ہوتی ہی۔ اُسے نشانہ بنانا نہایت مشکل امر ہی اور وہ تیر بھی کیسے تیر ہیں؟ کہ "بنک بلوکن بان" یعنی ترچھی نظر کے تیر ہیں جو ہمیشہ ٹیڑھے بانکے ہوتے ہیں۔ سیدھے ہوتے ہی نہیں۔ مگر اس پر بھی "چکت نہیں" وہ خطا نہیں کرتے۔ کیسے تعجب کی بات ہی۔

آہا ہا واہ وا واہ دوہی کی چھوٹی سی بحر میں کتنے متضاد اسباب جمع کئے ہیں نازک معشوق بغیر چلّے کی کمان۔ نشانہ متحرک۔ اور تیر کج مج۔ اگر اس پر بھی نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ تو پھر تیر انداز کے کمال قادر اندازی پر جس قدر تعجب کیا جائے بجا ہی۔ ناسخ لکھنوی جیسا مشہور اُستاد کہتا ہی ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو ۔۔۔ کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

سُبحان اللہ انداز بیان کی جس قدر تعریف کیجائے کم ہی مگر ان کا تیر انداز اناڑی ہی جسے چٹکی میں تیر تھامنا بھی نہیں آتا۔ آتش فرماتے ہیں ؎

---

[1] زِہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جسے بہاری نے "جِہ" لکھا ہی۔ معنی بھی وہی ہیں صرف زہ اور ج کا فرق جس سے ہندی لب و لہجہ مجبور ہی اور اُن کے حروف تہجی میں وہ حرف ہی نہیں ہی۔ مگر اس سے یہ بخوبی ظاہر ہی کہ اُس وقت بھی ہندو مسلمانوں کے میل جول نے اُردو تو اُردو ہندی پر بھی اپنا کتنا گہرا اثر ڈال دیا تھا اسی طرح جہاں تک میرا خیال ہی اور بھی کئی جگہ ایسی الفاظ آئی ہیں مگر میں نے سہواً اُن پر کوئی نوٹ نہیں لکھا

ترچھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار — جب تیر کج پڑے گا اُڑے گا نشانہ کیا

یہاں بھی وہی بات ہے۔ بلکہ ان کا اندازِ بیان بھی کچھ اچھا نہیں ہے۔ مصرعۂ ثانی میں پڑے گا اُڑے گا یہ دو روڑے ایسے ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں کہ سُننے اور سنانے میں بھی لطف نہیں آتا۔ ایک اور بزرگوار فرماتے ہیں۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یہ شعر حضرت میر مہدی حسین مجروحؔ دہلوی کا معلوم ہوتا ہے ؎

خطا کرتے ہیں ٹیڑھے تیر یہ کہنے کی باتیں ہیں — وہ دیکھیں ترچھی نظروں سے یہ سیدھے دل پہ آتے ہیں

یہ شعر البتہ قابلِ داد ہے۔ اگر دوہے سے بڑھ نہیں گیا ہے تو دبا ہوا بھی نہیں ہے کم سے کم ہم مضمون و ہم معنی ضرور ہے۔ اگرچہ دوہے کی طرح بہت سے اسباب مخالف اس میں جمع نہیں ہوئے ہیں۔ مگر الفاظ کتنے موزوں اور اندازِ بیان کیسا سُلجھا ہوا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

بہاری کا ایک اخلاقی دوہا بھی ملاحظہ ہو۔

दोहा

कनक कनक तें सौ गुनी, मादकता अधिकाय।
उहि खाये बौराय जग, इहि पाये बौराय ॥

دوہا

کنک کنک تے سَو گُنی مادکتا ادھکائے
اُوہ کھائے بَورائے جگ ایہہ پائے بورائے

یہ ایک سیدھا سادہ دوہا ہے۔ جس میں بظاہر صرف ایک لفظ کی شاعری ہے۔ مگر اندازِ بیان کتنا دلچسپ ہے اور مصرعۂ ثانی کیسا برابر کے دو ٹکڑوں پر تقسیم کرکے رکھدیا ہے کہ بغیر داد دیئے دل نہیں مانتا۔

کنک سنسکرت میں دھتورے کو بھی کہتے ہیں اور سونے کو بھی۔ لہٰذا شاعر کہتا ہے کہ کنک یعنی سونے میں کنک یعنی دھتورے سے سَو گُنا نشہ پیدا کرنے کی طاقت ہے۔ ثبوت میں کہتا ہے دیکھو اگر دھتورے کو لوگ کھاکر پاگل ہوتے ہیں تو سونے کو صرف پاکر ہی پاگل ہوجاتے ہیں۔ بقول شخصے ؎

چوں بدولت برسی مست نگردی مردی — بادہ نوشیدن و ہشیار نشستن سہل ست

یادگارِ غالب میں مولانا حالیؔ مرحوم و مغفور نے میرزا غالب اور حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے شعروں کا

ایک جگہ موازنہ کیا ہے۔ شعر مفصلۂ ذیل ہیں ؎

غالب

اُن کے آنے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہی

سعدی

گفتا بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم　　چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

اس موازنہ کا فیصلہ مولانا نے اس طرح کر دیا ہی کہ "مطلب تو دونوں شعروں کا تقریباً ملتا جلتا ہی مگر سعدی کے بیان میں اس قدر شبہ باقی رہجاتا ہے کہ ممکن ہی کہ معشوق اپنے عاشق کی ظاہری حالت سے اُس کے دل کی کیفیت کا اندازہ کر سکے۔ کیوں کہ وہ کہتے ہیں "معشوق کے آنے پر غم دل سے رخصت ہو جاتا ہی" مگر یہ نہیں کہتے کہ میری ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہی اور میرزا کے ہاں ظاہری حالت کا بدل جانا ہی مقصود ہی۔ غمِ دل بیان کرنے کا تذکرہ بھی نہیں ہی۔ لہٰذا یہاں معشوق کی غلط فہمی رفع ہونے کا امکان ہر طرح غیر ممکن ہے" تاہم مرزا کے شعر پر شیخ کے شعر کو ضرور ترجیح دینی چاہیئے۔ کیوں کہ شیخ نے یہ شعر مرزا کے شعر سے پہلے کہا ہی۔

اَب بہاری کا ایک دوہا مُلاحظہ فرمایئے۔ اُس نے بھی مرزا سے بہت پہلے لکھا ہی اور شیخ علیہ الرحمتہ سے اگر پہلے نہیں تو کم از کم فارسی نہ جاننے کی وجہ سے اُس کے کان اس شعر سے ناآشنا ضرور تھے۔

दोहा

जो वाके तन की दसा, देख्यौ चाहत आप।
तौ वलि नैकु विलोकये, चलि औचक चुपचाप॥

دوہا

جو واکے تن کی دسا دیکھیو چاہت آپ
تو بَل نیکُ بلوکےُ چل آؤ چک چُپ چاپ

ایک ہمدم و ہمراز جو عاشق اور معشوق دونوں کا ہمدرد ہی وہ معشوق سے کہہ رہا ہی "اگر آپ اپنے عاشق کی حالتِ زار دیکھنا چاہتے ہیں تو میں صدقے جاؤں ذرا اچانک اور چُپ چاپ چل کر دیکھئے"

مفہوم یہ ہی کہ اُسے کسی طرح یہ پتہ نہ چل جائے کہ آپ دیکھنے آرہی ہیں ورنہ اس خوشی کی خبر سے اُس کی حالت بدل جائے گی اور آپ اُس کی حالتِ صحیح کا اندازہ نہ کرسکیں گے۔

اب غور فرمایئے کہ مرزا کے شعر میں معشوق کے آنے سے مُنہ پر رونق آجاتی ہی اور سعدی کے شعر میں معشوق کے آنے سے غمِ دل کافور ہوجاتا ہی۔ مگر بہاری کے دوہی میں محض معشوق کے آنے کی خوشخبری سے عاشق کی حالت بدل جانے کا یقین ہی۔ میرے نزدیک تو شاعر نے نازک خیالی کی حد کردی۔ اس کے علاوہ بہاری نے جن ہندی محاورات کو نظم کیا ہے۔ جس بندش کی صفائی اور شوکت الفاظ سے کام لیا ہی اُس کا ذکر کرنا ہی فضول ہی۔ اب ایک اور دوہا سُنئے۔

दोहा

चिर जीवो जोरि जुरे, क्यों न सनेह गँभीर

को घाटे ये वृषभानुजा, वे हलधर के वीर ॥

دوہا

چِرجیو وجوری جُریئے کیوں نہ سینہ گنبھیر

کوگھٹِ یہ برشبھا نجُا وہ ہل دھر کے بیر

ایک گوپی جو برابر کی ہجولی ہی وہ رادھا اور کرشن کو دیکھکر کہتی ہے۔ "یہ جوڑی ہمیشہ سلامت رہی۔ اگر انھوں نے آپس میں گہری محبت کا ناتا جوڑا ہی تو اس میں تعجب کیا ہی۔ کیوں کہ کوئی کسی طرح کسی سے کم نہیں ہی یہ "بِرشبھانُجا" ہیں تو وہ "ہل دھر" کے بیر ہیں۔ یعنی یہ بِرشبھانکی بیٹی ہیں تو وہ "ہل دھر" کے بھائی ہیں۔

بِرشبھان رادھا جی کے باپ کا نام تھا۔ اور ہلدھر بلدیو جی کا۔ کیوں کہ ہَل ایک خاص وضع کے ہتیار کو کہتے ہیں جو بلدیو جی کا خاص حربہ تھا۔ لہٰذا اُن کا نام "ہل دھر" یعنی صاحب ہَل مشہور ہی۔

یہاں تک ایک معمولی تعریف ہی جسے شاعر نے اپنی طرف سے محبت کی وجہ قرار دیا ہے۔ مگر فی الحقیقت تعریف کے قابل وہ میٹھی چٹکی ہی جو کہنے والی سہیلی برابر کی ہجولی ہونے کی حیثیت سے ایک مزیدار مذاق کے طور پر لیتی ہے۔ اور وہ یہ ہی۔

"برشبھ" سنسکرت میں بَیل کو کہتے ہیں اور "انُوجا" بہن کو لہٰذا رادھکا جی تو بَیل کی بہن ٹھہیا ہوئیں اور ہَل

زمین جوتنے کا وہ اوزار ہے جسے ہندوستان میں ہمیشہ بَیل ہی کھینچتا ہے۔ اس لئے ہل دھر کے معنی ہوئے بَیل اور بیل کا بھائی بھی آخر بیل ہی ہوا۔ تو مطلب یہ رہا کہ رادھا تو بیل کی بہن بچھیا ہیں۔ اور کرشن چندر بیل کے بھائی بیل ہیں۔ لہٰذا دونوں ہمجنس ہیں پھر ان میں محبت ہونی ہی چاہیئے:

واہ واواہ خُدا کی قسم کی شاعری میں مذاق کی حد کردی اور پھر کس عالمانہ پہلو سے کہ سبحان اللہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ مگر اس میں شاعری کے ساتھ زبان کی وسعت بھی شامل ہے اگر زبان میں اتنی وسعت نہ ہوتی تو پنڈت بہاری لال کو یہ مضمون مُیسر نہ آتا۔

اب بہاری لال کا فن تصویر کشی ملاحظہ ہو۔ ظالم فقط لفظوں کے ہیر پھیر سے کتنا اچھا سین کھینچکر دکھاتا ہے

दोहा

हेर हिंडोरे गगनतें, परी परी सी टूट ।
धरी धाय पिय बीच ही, करी खरी रस लूट ॥

ہیر ہنڈورے گگن تے پری پری سی ٹوٹ
دھری دہائے پیا بیچ ہی کری کھری رس لوٹ
دوہا

ایک شرمیلی نازنین ہنڈولے پر جھول رہی ہے۔ سامنے سے اپنے پیارے پریتم کو آتے ہوئے دیکھکر شرم سے گھبرا جاتی ہے۔ اور گھبرا کر اس طرح گرتی ہے جس طرح آسمان سے پری ٹوٹ کر گرتی ہے۔ پریتم بھی یہ دیکھکر گھبرا جاتے ہیں اور گھبرا کر اس طرح دَوڑتے ہیں کہ پھُرتی سے بیچ ہی میں لپک کر دبوچ لیتے ہیں۔ بہاری لال دُور ہی سے یہ تماشہ دیکھکر فرماتے ہیں کہ ”واہ بھئی واہ بڑی مزے کی لُوٹ ہوئی“

اہاہا کیسا مزیدار سین کھینچا ہے۔ اب تمثیل کی تمثال ملاحظہ فرمایئے:-

दोहा

कुटिल अलक छुटि परत मुख, बढ़िगौ इतौ उदोत ।
वंक बँकारी देत ज्यों, दाम रुपैया हात ॥

کُٹل الک چھُٹ پرت مکھ بڑھ گو اِتو اُدوت
بنک بنکاری دیت جیون دام رُپیا ہوت
دوہا

کتنا ہی معشوق کے چہرے پر کا کل خمدار چھٹ پڑی جس کے بیچ میں حائل ہو جانے سے چاہیئے تو یہ تھا کہ شعاعِ حسن پر حجاب آجاتا۔ مگر ہوا یہ کہ حسن کی ضیا، اور روشنی اس طرح تیز اور اس قدر مجلا ہو گئی کہ جس طرح ایک "دام" پر ایک آڑا خط کھینچ دینے سے پورا ایک روپیہ بنجاتا ہے۔

دام ایک پیسے کے ۱/۲۵ ویں حصہ کو کہتے ہیں اور ہندی میں اُسے اس طرح لکھتے ہیں "۶" جب اسی دام پر ایک اور ترچھا خط اس طرح "۶" کھینچدیا جاتا ہے۔ تو وہ بجائے دام کے پورا ایک روپیہ پڑھا جاتا ہے اب دام اور روپیہ کے فرق پر نظر ڈالئے کہ وہ کتنا ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں تمثیل کی تمثال یعنی تشبیہ کی شبیہ کھینچکر دکھا دینا۔ اور بھی یک تمثیل اور اُس کے ساتھ شاعر کا قیاس اور اعتقاد ملاحظہ کیجئے۔

दोहा

पिय बिछुरन को दुसह दुख, हरख जात प्यौ साल।
दुरयोधन लौं देखियत, तजत प्रान यह बाल॥

دوہا

پئے بچھڑن کو دُسہ دُکھ ہرکھ جات پیو سال
دُریو دھن سَم دیکھئت تجت پران یہ بال

ناقابلِ برداشت دُکھ تو یہ ہے کہ پیارے پریتم سے جُدا ہوتی ہے۔ اور خوشی یہ ہے کہ اپنے مَیکے جا رہی ہے یہ رنج اور خوشی دونوں ایک ہی وقت میں واقعہ ہوئے ہیں لہذا بہاری لال کہتے ہیں دیکھئے کہیں ایسا نہ ہو یہ ناسمجھ بھولی بھالی دُریو دھن کی طرح اپنی جان دیدے۔

یہ دوہا روایت طلب ہے۔ اس میں دُریو دھن کی موت کی مثال دی گئی ہے۔ دُریو دھن وہ شخص ہے جو مہابھارت کی لڑائی میں پانچوں پانڈوں کا حریف مقابل تھا اس کو "شراپ" یعنی بد دُعا تھی کہ جب تجھ پر غم اور مسرت ایک ہی وقت میں طاری ہوں گے۔ ٹھیک اُسی وقت تیرا دم نکلے گا۔ چنانچہ جس وقت میدانِ جنگ میں بھیم کی گدا سے زخمی اور شکستہ ہو کر دُریو دھن خاک پر گرا تو بہت عرصے تک اُس کا دم نہیں نکلا۔ آخر جب سامنے سے اشوتھاما کو پانچ پانڈو پتروں[1] کے سر کاٹ کر لاتے ہوئے دیکھا تو فرطِ مسرت سے کھِل اُٹھا

---

[1] یعنی پانڈوں کے پانچ بیٹے

اور سمجھا کہ میرے پانچوں دشمن مارے گئے انتقام پورا ہو گیا۔ مگر جب قریب سے دیکھا تو نہایت صدمہ ہوا۔ کیوں کہ معلوم ہو گیا کہ اشوتھاما نے دھوکا کھایا اور بجائے دشمنوں کے دشمنوں کی اولاد ماری گئی۔ بس ٹھیک اسی وقت دم نکل گیا۔

یہ واقعہ شاعر کے ذہن میں ہی اور اس کے نزدیک گویا یہ قاعدہ کلیہ ہو گیا ہی کہ جب کسی کو مسرت وغم توام لاحق ہوا کرتے ہیں تو اس کا دم نکل جایا کرتا ہی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ یہ بھولی بھالی کم سن نازنین جس کے دل میں اپنے پریتم کی جدائی کا ناقابل برداشت دکھ موجود ہی خوشی سے ہنستی ہوئی اپنے میکے جا رہی ہی۔ کہیں ایسا نہو دریودھن کسی طرح اس کی بھی جان نکل جائے۔

اس خیال اور مثال میں کتنا پریم بھرا ہوا ہی۔ شاعر نے ایک تاریخی روایت سے اپنا اعتقاد کیسے بھولے پن سے قایم کیا ہی۔ اور پھر اسے نظم کرکے کتنی صفائی سے باندھ دیا ہی۔ یہی چیز قابلِ داد ہے اور اسی کا نام مضمون آفرینی ہے۔

میرے دوستو! مجھے افسوس ہی کہ میں نے صرف بہاری کا رنگ کلام دکھانے میں ہی اپنی تحریر کے ۲۳ صفحے رنگ دیئے۔ شاید چھپنے میں کچھ کم ہو جائیں۔ پھر بھی بہت ہی اگر اسی طرح باقیماندہ پانچ شعرا کے کلام پھر بھی ریویو کیا گیا تو ایک رسالے کا مضمون کا ہیکو اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔ لہذا اب مجبوراً اختصار سے کام لینا پڑے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مضمون بالا میں کسی قدر طول کلامی ضرور ہی۔ تاہم اس خیال سے کہ میں ہندی شاعری کی دعوت اپنے ان احباب کو دے رہا ہوں جو ہندی زبان سے بالکل ناواقف ہیں اس لئے لازم آیا کہ انھیں ایک ایک لفظ کی تشریح کرکے سمجھاؤں۔ اور آیندہ بھی میرے لئے یہ امر ناگزیر ہی مگر اس میں شک نہیں کہ میں نے بہاری کے دوہے ضرورت سے زیادہ منتخب کرلئے۔ آیندہ میں صرف ایک ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دو مثالوں پر اکتفا کروں گا اور وہی کافی ہو گا۔ بقول شخصے مشتے نمونہ از خروارے۔

باقی آیندہ

اِصلاحِ رسم الخط

از

(جناب سید احمد علی صاحب صدر مدرّس مدرسہ وسطانیہ بھینسہ ضلع نان دیڑ)

مندرجۂ عنوان پر سب سے پہلا مضمون مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب کا رسالہ اُردو نمبر ا میں نکلا ہے جس کا مقصد دو امور پر شامل ہے۔

(۱) رسم خط کی یکسانی

(۲) بعض حروف کی ساخت میں خفیف سی ترمیم تاکہ مبتدی اور اجنبی کو صحت تلفظ میں کوئی دقّت نہو۔

رسالہ نمبر ۳ میں اسی مقصد پر دوسرا مضمون مولوی ہاشمی صاحب کا اختلافات کے ساتھ درج ہوا ہے۔ عدم یکسانی کی اصلاح کی ضرورت کو لفظ کے جوڑ توڑ میں بتلایا ہے جس کے متعلق آئندہ نمبر میں تنقیدی بحث پیش کی جائیگی۔ حالانکہ یکسانی کی ضرورت حرف و اعراب کے رسم خط میں بھی معلوم ہوتی ہے۔

مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب کی مجوزہ اعرابی تنظیم پر مولوی ہاشمی صاحب کو اعتراض ہے کہ اس میں اعرابی حرکات کا استعمال ترک ہوگیا ہے۔ مولوی صاحب اول الذکر کی تجویز اس بنا پر ہے کہ اس کے ذریعہ ایک اجنبی اور مبتدی بلالحاظ سیاق عبارت اعرابی تلفظات پر حاوی ہو جائے۔ اس مقصد میں ہر ایک تلفظ اور اعراب کے لئے ایک جداگانہ مستقل شکل درکار ہے جس کا تعین رسم خط اُردو میں بہت دشوار ہے البتہ طباعت کی حد تک یہ دشواری دور ہو سکتی ہے۔ لیکن روزمرہ کی کتابت میں یہ پابندی ذرا دقّت طلب معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ موجودہ رسم خط کی حالت اصلاح طلب ضرور ہے۔

رسم خط اعرابی

(متعلق بہ حرف و اعراب)

اعراب کی تقسیم دو طرح سے ہے۔ اعراب بالحرکت ۔ اعراب بالحرف، جب اعراب کی تقسیم حرکت و حرف کے نام سے جدا جدا تسلیم کرلی گئی ہے۔ تو ایک دوسرے کی آمیزش کا استعمال خلاف اصول معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اعراب بالحرف میں حرکت کی آمیزش نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حرکت کا نشان مستقل شکل میں نہیں ہے۔ جو شبد یز قلم کی روانی میں قائم نہیں رہ سکتا ۔ بخلاف اس کے اعراب بالحرف ایک مستقل شکل واقع ہوتی ہے۔ جو تحریر کی روانی میں قائم رہ سکتی ہے۔ مگر حرکت کا ساتھ چھوٹ جانے سے اعراب بالحرف کا تلفظ مشتبہ ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں حرکت کا التزام ہونے پر بھی تلفظ کی صحت بعض اوقات قابل اعتبار نہیں رہتی ہے۔ جیسے "ربیون" کا تلفظ (رِ یَوَن) ہو جاتا ہے اگر حرکات وسکنات سے لفظ کی شکل لادی جائے تو روانی میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ اور پھر بھی صحت لفظی کی توقع اصولاً بہت کم ہوجاتی ہے جیسے ریٗون مگر اصولاً اعرابی حرف کی شکل جو بذاتہ کسی طرح بھی ملفوظ ہو نہیں سکتی ہرگز جزم کا نشان نہیں پا سکتی ہے۔ اسی طرح مختلف تلفظ کے دو لفظ (واو اعرابی و ملفوظی کے) سور۔ سُور اور روے اور روے (رِ ۔ وے) کی کتابت میں باہمی تلفظ کا امتیاز کسی طرح بھی پایا نہیں جاتا ہے۔ یہ مشکلات صرف اس وجہ سے پیش آتی ہیں کہ حرف اور اعراب کے نشان ایک ہی شکل میں واقع ہوگئے ہیں۔ جن میں حرفی اور اعرابی امتیاز نہیں پایا جاتا۔ ہاں ایک طریقہ امتیاز یہ قرار پا سکتا ہے کہ اعرابی حرف بعد میں واقع ہو تو وہ اعراب ہے ورنہ حرف ۔ مگر اس طریقہ کی مطابقت میں ایک ہی شکل حرف آلف کی ہے کہ جس کا ایک ہی اعراب مقرر ہے بخلاف اس کے وٓ اور یٓ کا مختلف اور متعدد اعرابوں میں استعمال ہے۔ معروف ۔ مجہول ۔ ماقبل مفتوح اور معدول

علاوہ بریں یہی اشکال مخلوط بھی ہوتے ہیں اور ملفوظ بھی جیسے کیا ۔ خوب ۔ اودھ ۔ بھُور ۔ سیر ۔ پھیر

پس انہی مشکلات وخصوصیات کے احساس پر مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب نے واوی اعرابوں کا داؤ کے مستقل اشکال مختلفہ میں اور یائی اعرابوں کا خود اسی کے نقطوں کے ہیر پھیر اور نشیب وفراز سے ایک جداگانہ امتیاز قائم فرمایا ہے جو نہایت ضروری ہے۔ مگر ان کی مرتبہ اعرابی تنظیم میں بھی نقائص حالیہ کا تدارک کما حقہ نہیں ہوسکتا ہے۔ بلکہ نسبتہً اضافہ کا احتمال ہے۔ جس میں خوش نمائی، صحت لفظی اور روانی کے امتیازات یک لخت نظر انداز ہوجاتے ہیں ۔

چنانچہ واؤ مجہول کی تشکیل (ر و) روانی میں مستقل نہیں رہ سکتی ہے۔ اور صورت میں (ر ف) سے مشتبہ ہو جاتی ہے۔ واؤ ماقبل مفتوح کی تصویر (ر و) سے مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ لفظ (ر و) کا رسم خط موصول ہے۔

واؤ کی معمولی شکل درمیان یا اخیر میں واؤ معروف اور واؤ ملفوظ دونوں کا کام نہیں دے سکتی اور نہ معدول و مخلوط کا اظہار کر سکتی ہے۔ رُوی اور رِدی کا مختلف تلفظ مرتبہ تنظیم مذکور کی صورت (روی - روی) میں ممیز نہیں ہوتا اس تنظیم میں جمع مکسر واوی کی تحریر کے لئے کوئی خاص صورت قابل امتیاز پائی نہیں جاتی جیسے ہندو سے ہندوؤں ایسے ہی ایک لفظ واؤ ملفوظی کا واؤ کی معمولی شکل سے جو کہ معروف کی آواز کے لئے مقرر ہوئی ہے۔ تلفظ میں کچھ کا کچھ ہو جائیگا جیسے (اودھ) کا تلفظ اُودھ ہوگا اور سیوں کا تلفظ سیوں (واحد متکلم)

اسی طرح یائے معروف کے امتیاز کے لئے دو عرضی نقطوں کا اتصال اور یائے مجہول کے لئے ایک عرضی خط اور ماقبل مفتوح کے لئے دو طولانی نقطوں کا تعین قرار دیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ نقطوں کا تعین محض حرفیت کے لئے مخصوص ہے۔ نہ کہ اعراب کے لئے اور نقطوں ہی کے تعین و تعدد سے مختلف الصوت حروف کی اشکال میں اختصار و امتیاز کا کام لیا گیا ہے۔ جس سے ایک ہی شکل (ب ح د ر س ص ع) کے حروف مختلف اصوات میں ملفوظ ہوتے ہیں۔ حروف تہجی کی تقسیم بھی نقطوں ہی پر ہوئی ہے۔ منقوط۔ غیر منقوط۔ غرض کہ اس نحیف الجثہ وجود نقطہ پر اختصاری اور امتیازی بار اتنا ڈالا گیا ہے کہ اُس کے سر سے اونچا اور جان سے بڑھکر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم صورت الفاظ کے تلفظ میں صحت کے لالے پڑ گئے ہیں۔ جیسے

(بنی - بنی + نبات - بنات) کی اشکال ہیں۔

علاوہ ازیں عرضی نقطوں کا اتصال اور خطِ عرضی کا باہمی فرق امتیاز از روئے اصول ہندسہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ نقطوں ہی کے اتصال سے خط بنتا ہے۔ پھر اس کی درمیانی حالت ملفوظی و مخلوطی ہنوز تشریح طلب ہے۔ اور جمع مکسر یائی کا بھی کوئی امتیاز قائم نہیں ہوا۔ جیسے

لڑکی سے لڑکیاں

لہذا زیر بحث رسم خط اعرابی کی تنظیم حسب ذیل تجویز کی جاتی ہے جو حملہ اشـ

نقشۂ تعریب نمبر ۱

واوی

معروف + ملفوظ = و .. .. .. (معمولی)

مجہول + مخلوط = و .. .. .. (سر حلقہ دار)

(ﯗ)

ماقبل مفتوح = ﯗ .. .. .. (سرا نیچے کو مڑا ہوا)

معدول = خ و { (گردن کٹی ہوئی دو کشش کی واؤ ہی) اور یہ رسم خط مخصوص ہی حرف ماقبل خ سے

معروف { رو - کھاو .. .. (بہت کھانے والا)

ملفوظ (درمیانی) منفصل ہو تو ماقبل سے - موصول ہو تو مابعد سے دور رہے تاکہ واؤ معروف کے تلفظ کا التباس نہو - جیسے اودھ - روے - روی - نول

(۱) یون - بھون -

(۲) (آخر لفظ) موصول ہو تو اُس پر جزم دیا جائے جیسے
گوْ - لکھنوْ

(۳) ماقبل اعراب ہو تو معروف و ملفوظ کا تلفظ ایک ہو جاتا ہی جیسے
کھاو - کھوو - رود

رت میں واو مجہول کا تلفظ پیدا ہوتا ہی جیسے
آب و ہوا

مجہول ۔ خود ۔ خول
مخلوط ۔ خواجہ ۔ خواہش

ماقبل مفتوح ۔ خوف ۔ حوض ۔ کون

معدول ۔ خود ۔ خور ۔ خورش ۔ آخوند ۔ خویش

نوٹ (۱) رسم خط اُردو میں ضرورت و بلا ضرورت پر کہیں واو معدولہ کا تداخل ہو رہا ہے جیسے
مونہہ ۔ پہونچ (مُنہہ ۔ پہنچ)
اس سے ضمہ کا وجود معدوم ہو جائیگا ۔ تو کسرہ کا اعراب خواہ مخواہ زیر دریافت پڑا رہیگا اور اعرابی تلفظات کے موقع اظہار پر تعلیم مقابلہ میں حرج واقع ہوگا ۔

نوٹ (۲) معدول کے لئے معمولی واو استعمال کی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے ماقبل و مابعد کا حصر ہو چکا ہے ۔

واو معدول:

خ و + د ⎫
خ وںّ + د ⎭ د
خ و + ر
خ و + ز
خ و + ش ⎫
خ وی + ش ⎭ ش

نوٹ (۳) معروف ۔ ملفوظ ۔ معدول = وٗ + مجہول ۔ مخلوط = وٓ + ماقبل مفتوح وٓ

نقشہ تعریب نمبر ۲

(یائی)

	مروجہ	مجوزہ
یائے معروف آخر لفظ	دِي	دی

	مروجہ	مجوزہ	
یائے مجہول آخر لفظ	دیے	دے	
〃 ماقبل مفتوح 〃 〃	دیۓ	دی	
〃 معروف درمیانی	بیر	بِر	(یِ)
〃 مجہول 〃	بیر	بہر	(ہی)
〃 ماقبل مفتوح 〃	بَیر	بہر	(ی)
〃 ملفوظ	×	سِیر	(ی)

الفاظ آخرالیا کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے اور کوئی فقرہ کوئی سطر اس قسم کے الفاظ سے خالی نہیں جاتی اس لئے یائی اشکال آخر لفظ مندرجہ بالا کا رسم خط نہایت مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک مفید تر سہولت سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ اگر ضرورت اجازت دے تو بنظر سہولت الف و آو کی طرح درمیانی (ی) کی اعرابی اشکال بھی مقطوع التحریر تصور کر لی جاتیں مگر اس میں مختصر نویسی کا وصف قائم نہیں رہتا جو رسم خط اُردو کی جان ہے۔

نقشۂ تعریب نمبر۳

یائے مخلوط

حروف مخلوط الیاء غیر متحرک اُردو میں جس قدر ملفوظ ہیں وہ یا تو الف کے ساتھ ہیں یا واو کی اعراب کے ساتھ۔

جو الف کے ساتھ ملفوظ ہو اس کے امتیاز کے لئے اسی الف کے سرے پر جزم موصول کی ذرا سی کشش ظاہر کر دی جائے۔ جیسے

کیا۔ پیاری ۔ دھیان ۔ گیان

جو واوی اعراب کے ساتھ ملفوظ ہے اس کے امتیاز کے لئے یائی نقطوں اور واوی اعراب کا اظہار کافی ہے۔ اُلٹے سیدھے جزم کا نشان لگانے کی ضرورت نہیں جیسے

کیوڑا - کیوں وغیرہ

الفاظ مخلوط الاعراب میں کوئی حرف مخلوط الیا و مخلوط الوا و نہیں ہوتا ہے اس لئے (ی) کو نقطہ اور جزم لگانے کی ضرورت نہیں جیسے

دِہو - ہِنولا - جھوڑا - لِہو (بہت لینے والا)

جھوڑا کا واو معروف ہے اور لہو کا ملفوظ لیکن دونوں کا تلفظ ایک ہے۔

حروف (و اور ی) میں سے ہر ایک میں قوت تجاذب اور لطافت اس قدر ہے کہ وہ ساکن ہو کر بھی اپنے ماقبل و مابعد (حروف اعرابی) کے باہمی تلفظ کو مانع ہوتا ہے۔ و اور ی کا یہ تجاذب ماقبل کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرف ماقبل کی آواز (و - ی) کے تلفظ میں سے ایسی گزر جاتی ہے جیسی کہ روشنی ہوا اور شفاف شیشہ میں سے۔ اس لئے (و - ی) مخلوطی کا امتیاز معمولی جزم سے قائم ہو سکتا ہے۔ مگر واو مخلوط کے لئے علیحدہ ایک مستقل شکل مشخص ہو چکی ہے۔ اب صرف یائے مخلوطی کے لئے جزم کا استعمال رہ گیا ہے۔ نقشہ ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہجّا
(۱) خوْ آ = خوا
(۲) خ وا = خوا

خواجہ

"
(۱) کیْ آ = کیا (کیا)
(۲) ک یا = کیا (کیا)

"
ک یو = کیو، کیوڑا
ک یو = کیو، کیوں
جزم و بلا جزم دونو طرح ظاہر کر سکتے ہیں

(حروف مخلوطی)

مولوی ہاشمی صاحب کے خیال کے موافق حرف غنہ کی تشکیل و تمثیل پر ہر ایک مخلوطی حرف کو اُلٹا جزم لگا کر ایک قاعدہ کی تحت میں نہیں لایا جا سکتا ہے ورنہ تمام مخلوطی حروف غُنغُنے ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ اُلٹا جزم محض حرف غنہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔ یا نون غنہ خود نون مخلوط ہو جائے گا۔ جیساکہ دُنہ کا مخلوط حرف ہندی میں موجود ہے۔ مخلوط حرف کا ہر ایک جُز کم و بیش تلفظ کے ساتھ جداگانہ ملفوظ ہوتا ہے۔ اجزائے مخلوط کے تلفظات میں (۱) ۲ کی نسبت ہوا کرتی ہے یعنی مقدم کا تلفظ تالی سے بہت کم ہوتا ہے مگر حرف غنہ میں مقدم ملفوظ ہے اور تالی غیر ملفوظ اس لئے نون غنہ جزو مخلوط نہیں۔ رسم خط اُردو کا نون غنہ وہ نہیں ہے جو عربی میں بصورت (ً یاںْ وٌ) تنوین یا نون ساکن ماقبل (و ۔ ی) مشدد، ملفوظ ہے۔ اُردو میں نون غنہ حرف نہیں بلکہ ایک مخرج نما یعنی انتقال مخرج کی ایک علامت (بشکل حرف بلا نقطہ) ہے جس کے ذریعہ ہر ایک حرف کی آواز ساد یا اعرابی ناک کے مخرج میں منتقل ہو جاتی ہے یعنی مُنہ کا تلفظ ناک کے تلفظ سے بدل جاتا ہے۔

نون غنہ کا مخلوط ہونے سے پہلے کوئی مستقل وجود نہیں جیساکہ (ھ) مخلوطی کا مخلوط ہونے سے پہلے پایا جاتا ہے۔ حرف غنہ کا جوڑ دوسرے حرف مخلوط کی طرح بالا عراب ہونے کی حالت میں کسی طرح مستقل شکل میں نہیں پایا جاتا اس لئے اُس کا شمار مخلوطی حروف میں نہیں ہو سکتا۔

اگر نون غنہ کا کسی حرف کے ساتھ جوڑ لگا کر یا اس کو حرکتِ بے جا میں رکھ کر اس کی مستقل شکل مان لی جائے تو خواہ مخواہ رسم خط اُردو کی تعمیر و تشکیل کچھ سے کچھ ہو جائیگی چنانچہ الفاظ (یاںٓ ۔ یوںٓ اور واںٓ) کا رسم خط یوں ہو جائیگا۔

یںٓا ۔ یںٓو ۔ وںٓا

نوٹ :۔ نون غنہ بلا نقطہ کے ہو اس پر اُلٹا جزم کافی ہے

پس جب حروفِ نونی (حروف غنہ) پر حروف مخلوطی کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے تو اُس کی مخصوص علامت اُلٹے جزم کا استعمال حروف مخلوط کی تخصیص پر حاوی نہیں ہو سکتا اور خود حرف غنہ باعتبار کتابت حرف مخلوط

ہو نہیں سکتا۔

اسی طرح ہائی حرف بھی بلحاظ تلفظ کے مخلوط حرف نہیں ہو سکتا۔

گو یہ حرف مرکب مانا اور دیکھا جاتا ہے مگر چونکہ تلفظ میں اس کی آواز ایک مستقل آواز ہوتی ہے اس لئے مستقل آواز کی شکل بھی مستقل ہونی چاہئے نہ کہ مشترک۔

اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ بلا توسط اعراب وسطی ایک وقت میں دو سے زیادہ مخلوط حروف کا تلفظ ہو نہیں سکتا جیسا کہ حروف مخلوط واوی اور یائی کے تلفظات سے ظاہر ہے۔ پس اگر حرف ہائی کو تلفظ میں بھی مخلوط مان لیا جائے تو پھر اصولاً کوئی تیسرا حرف مخلوط اس کے ساتھ متلفظ نہ ہوگا اگر ہوگا تو وہ حرف مخلوط کا جزو ثانی متصور ہوگا اور پہلا حرف مخلوط نہیں بلکہ بلحاظ تلفظ صرف ایک حرف مستقل سمجھا جائیگا جیسا کہ دھیان اور گیان میں ہے، جس میں مخلوط کا جزو ثانی (ی) ہے اور جزو اول دھ اور گ۔ پس باعتبار تلفظ کے مخلوط کا ہر ایک جزو منجملہ دو کے ایک مستقل حرف ہوتا ہے اس لئے دھ کا تلفظ مفرد اور مستقل ہے مخلوط نہیں جو حرف آواز میں مستقل ہے وہ شکل میں بھی مستقل ہونا چاہیئے نہ کہ مشترک مستقل حرف ہمیشہ (بجز نقطہ) بلا علامت کے ہوتا ہے اگر ایک مستقل حرف بھی علامت دار ہو تو وہ علامت اور اعراب سے لدلدا کر خارجی اشکال کا باربردار ہو جائیگا مثلاً پھول کا سرحرف مضموم (پُھپّہ) قلم کی روانی میں تمام خارجی اشکال کا منقوط واقع ہوتا ہے مزید براں بچہ اور مبتدی کو بجائے مرد کے طومار بے تمیزی میں مبتلا ہو کر سرے سے حرف سازی و حرف بازی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہائی حرف کی کوئی مختص اور مستقل شکل علیحدہ نہ ہوگی تو ایک ہی شکل (ہ) پر تین مختلف تلفظات کا عمل و استعمال ایک بار گراں ہو جائیگا اور تلفظ کی صحت میں بھی احتمال و التباس کی مداخلت ایک حد تک جائز ہو جائیگی۔ مثلاً

رتھَّہ - زِرہ - زرہ

ایک ہی شکل (ہ) کے تین نام ہوتے ہیں مخلوطی۔ ملفوظی۔ مختفی

زِرہ کا ہائے ملفوظی اخیر میں ہے۔ اخیر حرف پر جزم کی ضرورت نہیں ہوتی حرف کا اخیر ہونا جزمی حالت حالت سمجھی جاتی ہے تو اس صورت میں ہائے ملفوظی (آخر لفظ) اور ہائے مختفی کی اشکال میں کوئی باہمی امتیاز نہیں یہ بے امتیازی خالی از التباس نہیں۔ یہاں رسم خط کی یکسانی میں تلفظ کی یکسانی کا احتمال قوی ہے۔ اس لئے

یہ امر گزیر ہوگیا ہے کہ ہر ایک (ہ) کی صورت کا رسم خط جدا جدا قرار پائے تاکہ تلفظ میں رفع التباس ہو۔

مختلف آواز کی مختلف صورتیں

(۵)

مخلوطی	ملفوظی	مختفی
ھ	ہ	ے

رسم خط منفصل۔ ریڑھ ... زِرہ ... زرہ

" متصل = چھ ... چہہ (کھنی دار بلا شوشہ زیریں) چیہ

نوٹ:۔ اشکال مذکورۂ بالا کا رسم خط فی الحال مروج ہے۔ حرف منفصل کے ساتھ بھی (ہ) مختفی کی شکل پیوستہ ہے۔

رسم خط اعرابی کی یکسانی

(۱) [ا - یٰ]

یک (ی) اور ہے جس کا رسم خط اب تک معین نہیں ہوا ہے وہ اپنی ہر سہ اشکال آخر میں لکھی جا رہی ہے یعنی معروف۔ مجہول اور ماقبل مفتوح میں جیسے معنیٰ۔ معنے۔ معنی۔ اِس کا تعین ضروری ہے۔ اس کی تشکیل اس کے تلفظ کے مطابق ہونی چاہیئے یعنی اُس کا تعین شکل الف سے ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اکثر الفاظ ایسے ہیں بھی جن کی کتابت آلف اور یٰ دونو اشکال میں جاری ہے۔ مگر اصولاً یکسانی لازم ہے۔ پس الف ممدودہ کی کتابت قائم کرلی جائے تو املا کا دُبدھا دُور ہوجاتا ہے۔

مثلاً

الف مقصورہ		الف ممدودہ	
معنیٰ ۔ معنیٰ ۔ معنےٰ	.. ..	معنا	وغیرہ
علیٰحدہ	.. ..	علاحدہ	
معریٰ	.. ..	معرا	
مجریٰ	.. ..	مجرا	
مولیٰنا	.. ..	مولانا	
مدعیٰ	.. ..	مدعا	
یحییٰ	.. ..	یحیا	

اظہار وحذف (الف)

(۲)

وہ الفاظ جو الف کے اظہار وحذف سے دونو طرح لکھے جاتے ہیں۔ ان کو محض الف کے اظہار سے لکھا جائے۔

بحذف الف = ثلٰث ۔ یٰسین ۔ اسحٰق ۔ سبحٰن ۔ رحمٰن } وغیرہ
باظہار الف = ثلاثہ ۔ یاسین اسحاق سبحان رحمان }

تلفظ کی یکسانی

(۳)

جس طرح رسم خط کی یکسانی ایک ضروری چیز ہی اسی طرح اس رسم خط کے تلفظ میں بھی یکسانی ہونا ضروری بات ہی۔ اس لئے الفاظ مندرجہ حاشیہ ع۱ سے یائے معروف کے الفاظ کو یائے معروف پر ختم کیا جائے جیسا کہ نمبر ۲ میں ہے۔ کیونکہ وہ مرکب ہیں۔ اُن + ہی ۔ اِن + ہی سے ایسے ہی

نمبر ۱
اُنھیں } اُنھیں
اِنھیں } اِنھیں

نمبر ۲
اُنھی } اُسے
اِنھی } اِسے

یائے مجہول کے الفاظ کو یائے مجہول پر ختم کیا جائے کیونکہ وہ مرکب ہیں ۔

اُن + ے - اِن + ے سے یہاں یائے مجہول علامت مفعول ہے ۔

اِن لفظوں میں غنہ کی آواز قدرتاً پیدا ہوجاتی ہے نون غنہ لگانے کی ضرورت نہیں یہ صرف تلفظ غنہ کے اظہار پر نون غنہ کی زائد کتابت ہونے لگی ہے جس سے یائے معروف و مجہول کا اعرابی امتیاز قائم نہیں رہتا ہے ایسے ہی - وہی اور یہی کا رسم خط خلاف اصول کبھی کبھی وہ ہی اور یہ ہی بھی دیکھا جاتا ہے یہ صورت محض ضرورت شعری میں آسکتی ہے ۔

رسم خط کی یکسانی اور اس کا تعین مطابق تلفظ کے

مندرجہ حاشیہ الفاظ، متقابل الفاظ ہیں اور سب کا سر حرف الف ہے۔ اگر اعراب کا استعمال ترک کیا جاتا ہے تو تلفظ کی یکسانی اور اس کا تعین قائم نہیں رہتا اور اعراب کے استعمال میں قلم کی روانی رک جاتی ہے۔ جیسا کہ نمبر ایک میں ہے۔

نمبر (۱) مروجہ

اُس	اِس
اُسی	اِسی
اُن	اِن
اُنھی	اِنھی
اُنھے	اِنھے
اُدھر	اِدھر

اگر واو کا استعمال کیا جاتا ہے تو رکاوٹ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ نمبر ۲ سے ظاہر ہے کہ جس میں پہلے تو اعراب کی قوت المضاعف کردی جاتی ہے پھر علامت نفی کے استعمال سے اس کی تنصیف بھی کی جاتی ہے پھر طول عمل یقیناً قلم کی روانی میں حائل ہوجاتا ہے۔ اگر علامت نفی کا استعمال جلدی میں ترک ہوجائے تو تلفظ مشتبہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً

اوس (شبنم)

نمبر (۲) مروجہ

اوِس	اس
اوِسی	اسی
اوِن	ان
اوِنھی	انھی
اوِنھے	انھے
اوِدھر	ادھر

نمبر (۳) مجوزہ

اس	اسی

یہ اس وجہ سے کہ واو معدولہ کی کوئی خاص شکل معین نہیں اس کا تعین

واوملفوظی کی خاص شکل کے ذریعہ صرف اس وقت ہوسکتا ہے کہ ماقبل اس کے (خ) ہو اور مابعد (د - ر - ش - ند - ی) پس اس کے امتیاز کا طریقہ آسان یہی ہے کہ الف مضموم کو خط نسخ میں لکھا کریں تو ایک مستقل صورت ہوجاتی ہے جیسا کہ نمبر (۳) میں درج ہے۔ یہ ایک ہی کشش میں لکھا جاتا ہے اور اس کا استعمال بھی خاص خاص صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس کے تلفظ میں مبتدی اور منتہی سب غلطی کر جاتے ہیں۔ پس بروے اصول ریاضی دو اجزا کے مجموعہ میں سے جب ایک جزو متمایز ہوجاتا ہے تو دوسرا از خود ممیز ہوجاتا ہے۔ اس لئے دوسرے متقابل لفظ میں الف مکسور کے اظہار میں کسی امتیازی علامت و صورت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسی	اسی
اِن	اُن
اِنھی	اُنھی
اِنھے	اُنھے
اِدھر	اُدھر

نوٹ:- یہ شکل رسم خط زیر بحث میں ضمہ موصول کی تصور کی جائے۔

(باقی دارد)

یائے مجہول کے الفاظ کو یائے مجہول پر ختم کیا جائے کیونکہ وہ مرکب ہیں -

اُن + ے - اِن + ے سے یہاں یائے مجہول علامت مفعول ہے -

اِن لفظوں میں غنہ کی آواز قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے نون غنہ لگانے کی ضرورت نہیں یہ صرف تلفظ غنہ کے اظہار پر نون غنہ کی زائد کتابت ہونے لگی ہے جس سے یائے معروف و مجہول کا اعرابی امتیاز قائم نہیں رہتا ہے ایسے ہی - وہی اور یہی کا رسم خط خلاف اصول کبھی کبھی وہ ہی اور یہ ہی بھی دیکھا جاتا ہے یہ صورت محض ضرورت شعری میں آسکتی ہے -

رسم خط کی یکسانی اور اس کا تعین مطابق تلفظ کے

مندرجہ حاشیہ الفاظ، متقابل الفاظ ہیں اور سب کا سرِ حرف الف ہے - اگر اعراب کا استعمال ترک کیا جاتا ہے تو تلفظ کی یکسانی اور اس کا تعین قائم نہیں رہتا اور اعراب کے استعمال میں قلم کی روانی رُک جاتی ہے - جیسا کہ نمبر ایک میں ہے -

نمبر (۱) مروجہ

اُس اِس
اُسی اِسی
اُن اِن
اُنھی اِنھی
اُنھے اِنھے
اُدھر اِدھر

نمبر (۲) مروجہ

اوِس اس
اوِسی اسی
اوِن ان
اوِنھی انھی
اوِنھے انھے
اوِدھر ادھر

اگر واو کا استعمال کیا جاتا ہے تو رکاوٹ اور بھی بڑھ جاتی ہے - جیسا کہ نمبر ۲ سے ظاہر ہے کہ جس میں پہلے تو اعراب کی قوت المضاعف کردی جاتی ہے پھر علامت نفی کے استعمال سے اس کی تنصیف بھی کی جاتی ہے پھر طول عمل یقیناً قلم کی روانی میں حائل ہو جاتا ہے - اگر علامت نفی کا استعمال جلدی میں ترک ہو جائے تو تلفظ مشتبہ ہو جاتا ہے - مثلاً

اوس (شبنم)

نمبر (۳) مجوزہ

اس اسی

یہ اس وجہ سے کہ واو معدولہ کی کوئی خاص شکل معین نہیں اس کا تعین

واو ملفوظی کی خاص شکل کے ذریعہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ ماقبل اس کے (خ) ہو اور مابعد (د ۔ ر ۔ ش ۔ ند ۔ ی) پس اس کے امتیاز کا طریقہ آسان یہی ہے کہ الف مضموم کو خط نسخ میں لکھا کریں تو ایک مستقل صورت ہو جاتی ہے جیسا کہ نمبر (۳) میں درج ہے۔ یہ ایک ہی کشش میں لکھا جاتا ہے اور اس کا استعمال بھی خاص خاص صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس کے تلفظ میں مبتدی اور منتہی سب غلطی کر جاتے ہیں۔ پس بروے اصول ریاضی دو اجزا کے مجموعہ میں سے جب ایک جزو متمایز ہو جاتا ہے تو دوسرا از خود ممیز ہو جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے متقابل لفظ میں الف مکسور کے اظہار میں کسی امتیازی علامت و صورت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسی	اسی
اِن	ان
اُنھی	انھی
اُٹھے	اٹھے
اُدھر	ادھر

نوٹ:۔ یہ شکل رسم خط زیر بحث میں ضمہ موصول کی تصور کی جائے۔

(باقی دارد)

اصطلاحات نباتات

Abama	لنگار
Abaxial	خارج المحور
Abelicea	ابلیشیه
Abelmoschus	(عربي) ابولمسک
	(فارسي) مشک دانه—
Abies	تنوب
Abjoint	بند کشائي
Abroma	ناماکول
Abronia	زیبا
Abruptly Acuminate	بےطور نکیلا
Abruptly Pinnate	بےطور پریلا
Abrus	ناعمه
Abscise	کٹنا
Abscission	کٹاون
Absciss Layer	کٹ پرت
Absinthium	افسنتین
Abstricted	گزیده
Abstriction	گزیدگي
Absus	ابسوس
Abutilon	توذه–ابوطیلون
Abuta	ابوتا
Acacia	اقاقیا
Acajou	کاشو–اکازو
Acalepha	کوکلي–کپي–شبک
Acanaceous	خاردار–کٹیلا
Acantha	خار–کانٹا
Acanthaceae	شوکایه
Acanthocladous	کٹ شاخه
Acanthopodous	خاریا
Acanthus	شوکهه
Acalycal	بے کاسه
Acalyculate	بے کاسه
Acanthocarpous	کٹ پهلا
Acanthon	خار–کانٹا
Acaulescent	بے ساق
Acapsular	بے غلاف
Acarpelous	بےبرچه - بےثمیر
Acarpous	بے بر–بے ثمر
Acauline	بے ساق
Acaulose	بے ساق
Accessory Bud	اضافي کلي
Accessory Fruit	اضافي پهل

Accessory Shoot	اضافی ڈلا
Accrescent	بالندہ
Acer	اسفنداں
Aceraceae	اسفندایلہ
Aceraceous	اسفندایلی
Acervulus	تودک
Acetabuliform	کاسکماں
Acetabularia	کاسکیہ
Achariaceae	اکارایلہ
Achariaceous	اکارایلی
Achene	بیفازہ
Achenial	بیفازی
Achilary	بےلب
Achillea	اکلیزیہ
Achimenes	اکمنز
Achlamydeae	بےلبادیہ
Achlamydeous	بے لبادی
Achorion	قشارہ
Achras	سابو طیہ - اشرس
Achroanthes	بے رنگلہ
Achyranthes	سبوس گلہ
Aciculate	سوزنیلا - سوزندار
Acheilous	بے لب
Achenocarp	بیفاز پھل
Achenodium	بیفازینہ
Acinaceous	دانہ دار
Acinaciform	تیغہ نما
Acidaspis	نوکدڈھال
Acinacifolfous	تیغ برگہ
Acinarious	دانہ پوش
Aconitum	بچھناگ - بیش
Acorus	ڈریریہ - شکرساق
Acondylous	بےرباط - بے بند
Acotyledon	بےفلقہ
Acrasia	دشامیز
Acrasiaceae	دشمیزایلہ
Acrasiales	دشمیزیلہ
Acrocarpi	سرثمرے
Acrocarpous	سر ثمری
Acrocomia	سر بال
Acrodromous	نوکرس
Acrogen	سر دم

Acrogenous	سردمی
Acramphibryous	هر کنار دم
Acrobryous	سر نمو
Acrocarp	سر ثمره
Acrogamous	سرتخمه
Acrogamy	سر تخمی
Acrogenic	سردمی
Acrogynous	سرمادی
Acropetal	سرجو
Acrospire	سرپیچ
Acrospore	سردانه
Acrostichum	زیرتخمه
Acrosporous	سردانی
Acrosarcum	سرگرده
Acroscopic	سربین
Acrostichoid	زیرتخمان
Actaea	شهدار
Actinomyces	کرن کھمی
Actinocarp	کرن پھل
Actinodromous	کرن دوڑ
Aculeate	سوزنگ‌وار

Acuminate Leaf	نوکدار پتی
Acute Leaf	دھاردار پتی
Acuan	اکوان
Athyrium	لاترسیہ
Atropa Belladonna	لفاح قتال
Auricula	اذنہ
Autogamy	خود باروری-خودباری
Autogamic	خودبارور-خودبار
Autogamous	خودبارور خودبار
Autophyllogeny	خودبرگ زائی
Autophyte	خودغذا
Azalea	خشکرو
Azolla	سکھامار
Azygospore	طاق بزیره
Azygosperm	طاق نطفہ
Babiana	میمونیہ
Baccharis	بکریس
Bacillariaceae	چوبکایلہ
Bacillariaceous	چوبکایلی
Bacillariales	چوبکیلہ
Baccharoid	بکرتسا

Bacteroid	جرماسا
Balanophora	بلوطیلا
Balanophoraceae	بلوطیلایله
Balanophoraceous	بلوطیلایلی
Balanops	بلوطمان
Balanopsidaceae	بلوطمانایله
Balanopsidales	بلوطمانیله
Balaustion	گلناره
Balsam	بلسان
Balsamea	بلسانیه
Balsameaceae	بلسایله- بلسانایله
Balsameaceous	بلسایلی-بلسانایلی
Balsaminaceae	بلسمینایله
Balsaminaceous	بلسمینایلی
Balsamine	بلسمین
Barbellate	ریشکدار
Barosma	گران بویه
Bartonia	برطونیه
Basella	باسیله
Basellaceae	باسولایله
Basellaceous	باسولایلی
Basidial	بنایکی
Basidiolichenes	بنایک‌خراز
Basidiomycete	بناکهمبی
Basidiomycetous	بناکهمبیلا
Basidiophore	بنایک دار
Basidiospore	بنایک‌بزیره
Basidiosporous	بنایک بزیری
Basidium	بنایک
Basifugal	بناگریز
Basifugally	بناگریزانه
Basidiogenetic	بناخیز
Basifixed	بناباینده
Basipetal	بناجو
Bassia	باسیه
Bauera	بوئریه
Bauhinia	بوهینیه
Beaumontia	بوماشیه
Bebeero	بی‌بی‌رو
Beggiatoa	بجاتیه
Begonia	بگونیه
Begoniaceae	بگونایله

Begoniaceous	بکونایلی
Belladonna	لفاح
Benzoin	اوبان
Berberidaceae	بربرایله
Berberis	دارهلد-بوباریس
Berberidaceous	بربرایلي
Berchemia	برکومیا
Bergamot	بیگ‌ارمودي
Bertholletia	برطرلوشیه
Bessara	بسوریه
Bicarpellary	دوبرچي
Bicollateral	هم جانب
Bicollaterality	همجانبیت
Bicostate	دوپسلیا
Bicrenate	دودنتیا
Bidental	دودنتا
Bifarious	دونقطیا
Bitorate	دو-وراخه
Bitorine	دودره
Bignonia	بکنونیه
Bignoniaceae	بکنونایله
Bignoniaceous	بکنونایلي
Bijugate	دوجفته
Bikukulia	دوخوله
Bilabiate	دولبه
Billbergia	بلبرجیه
Bilocellate	دوخانکي
Bipetalous	دوگلبرگه
Bipinnate	دوپریا
Bipinnatiparted	دوپربانتیا
Bipinnatisected	دوپرکتا
Bixa	بکسا
Blandfordia	بلنفوریه
Beohmeria	بومیریه
Boerhavia	بورهاویه
Boletaceae	بلوطایله

Boletaceous	بلوطالي
Boletus	بلوطيه
Bomarea	بوماريه
Bombacaceae	پنبايله
Bombacaceous	پنبايلي
Bombax	كپاس-پنبه
Borage	مويه
Boraginaceae	موايله
Boraginaceous	موايلي
Borago	موايلا

تبصرہ

۱۔ مقالاتِ زرّیں[1]

۲۔ جذباتِ فطرت[2]

۳۔ اوراقِ سحر[3]

یہ تینوں ننھے ننھے کتابچے بہت چھوٹی تقطیع پر ہیں۔ ان کے مصنف جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی ہیں۔ جن اصحاب نے روحِ ادب کو ملاحظہ فرمایا ہے وہ آپ کے طرزِ تحریر سے واقف ہیں۔ یہ کتابچے بھی اُسی رنگ کے اور اُسی کے بچے ہیں۔

مقالاتِ زرّیں

مقولے، حکمت، تجربے اور ذوق کا عطر ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس قسم کی چیزیں لکھی ہیں مگر دنیا میں بہت ہی کم بلکہ گنتی کے چند ہی ایسے حکیم منش ادیب ہوئے ہیں جنھیں کامیابی ہوئی ہے۔ اور جن کے مقولے زبان زدِ خاص وعام اور مقبولِ خلائق ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں یا جہاں کہیں فارسی رائج ہے۔ یہ بلند رتبہ سعدی سے بڑھکر کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ درحقیقت یہ ہے کہ اس کے مقولے ادب حکمت کی جان ہیں۔ اسی طرح فرانس میں پاسکل (Pascal) کو اور انگلستان بیکن و شیکسپیر کو یہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ حضرت جوش

---

[1] مقالاتِ زرّیں صفحات ۶۰ قیمت ۱۱ر

[2] جذباتِ فطرت صفحات ۱۴ قیمت ۳ر

[3] اوراقِ سحر صفحات ۳۰ قیمت ۵ر

ملنے کا پتہ:۔ رئیس احمد خاں صاحب رئیس۔ ملیح آباد۔ لکھنؤ

نے بڑی کٹھن منزل میں قدم رکھا ہے۔ ایک پرجوش نوجوان شاعر یا ادیب کو اس سرزمین پر پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ اس کے لئے علاوہ شاعر یا ادیب یا صاحب ذوق ہونے کے پختگی اور تجربہ بھی شرط ہے۔ عمر کی کئی منزلیں طے کرنے کے بعد انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جو دلوں میں گھر کر سکے اور عام و خاص میں درجۂ قبولیت کو پہنچ سکے۔ اس کے سوا طرزِ ادا میں بھی شیرینی، لطافت اور ندرت درکار ہے۔ تاہم حضرتِ جوش کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ جو چیزیں انھوں نے اپنا دل خوش کرنے کو لکھی ہیں وہ اُن کے بعض دوستوں کے لئے بھی موجب مسرّت ہوں گی۔ کم سے کم یہ ضرور ہے کہ شایقین ادب کا آدھ گھنٹہ مزے سے گزر جائے گا۔ مگر انھیں وہ رتبہ نصیب نہیں ہو سکتا جس کی مصنف کو آرزو ہے۔ ہنوز دلّی دور است۔ ابھی انھیں بہت مشق تجربہ اور اصلاحِ ذوق کی ضرورت ہے۔ اس مجموعہ میں کل مقولے (جن میں سب سے چھوٹا آدھی سطر کا اور سب سے بڑا تین سطروں کا ہے) ۲۶۴ ہیں ان میں بعض اخلاقی نکتے ہیں کچھ تخیّل کی جولانیاں کچھ معمولی خیالات ہیں جنھیں شاعرانہ طرز میں ادا کر دیا گیا ہے اور کچھ شاعرانہ تشبیہیں ہیں اور بعض بالکل سپاٹ ہیں۔ ہمارے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے جملوں (یا مقولوں) کو اس مجموعہ میں داخل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

۱۔ بے سروسامانی میری محافظ ہے۔

۲۔ سلطنت جمہوری اچھی

۳۔ پبلک میں قوّت حکمرانی کا پیدا ہو جانا جمہوری سلطنت کی تمہید ہے۔

ان میں نہ کوئی خیال کی خوبی ہے نہ بیان کی۔

آخر میں ہم نمونے کے طور پر چند مقولے دیتے ہیں جن کا پڑھنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ یہ اُن کے بہترین مقولوں میں سے ہیں۔

دولت بہت سے ذائقے خراب کر چکی ہے، کہیں چکھ نہ لینا۔

پہلے دنیا ماں کی طرح تھپکتی ہے اور سو جاؤ تو گلا گھونٹ دیتی ہے۔

خوب رو لئے تو وہ ہنسنے لگا۔ پانی برس چکا تو دھنک نکل آئی۔ غریب کی عرق آلود پیشانی

پر کوئی بوسہ نہیں دیتا۔

رواج بڑی سے بڑی چیز سے مصافحہ کرا دیتا ہے۔

بعض اس قدر مغرور ہیں کہ راستے میں اگر خدا بھی مل جائے تو وہ سلام طلب کریں۔

" آسانیاں" دراصل بھیس بدلے ہوئے "مشکلیں" ہیں۔

جھوٹے کا آغاز اس قدر بلند ہوتا ہے کہ لوگ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ لیکن انجام میں لوگوں کو غاروں میں جھک جھک کر دیکھنا پڑتا ہے۔

تمام دنیا کے بہترین پھول۔ اور بہتر سے بہتر اُستادوں کے بنائے ہوئے عطر وہ خوشبو پیدا نہیں کر سکتے جو برسات کا پہلا چھینٹا پیدا کرتا ہے۔

کوئی جانور ایسا قابل مضحکہ اور شایانِ تمسخر نہیں جس طرح ایک مغرور مجتہد۔

جسے تو سررشتۂ مسرت سمجھکر مضبوط پکڑے ہوئے ہے وہ تو دراصل اژدہے کی دُم ہے۔

آدمی کے تین رُخ ہوتے ہیں (۱) جیسا وہ اپنے کو سمجھتا ہے (۲) جیسا لوگ اُسے سمجھتے ہیں۔ (۳) جیسا وہ خود ہے۔

مولانا حالی مرحوم نے اسی خیال کو کس خوبی اور نزاکت سے ادا کیا ہے اور اسی سے طرز بیان کا فرق معلوم ہو جاتا ہے ؎

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں   اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں

اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے   بس مجھکو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

جذباتِ فطرت

شاعر نے اس میں یہ راز بتایا ہے کہ کائنات کی ہر شے شاعر کو اپنی طرف بلا رہی ہے اور مظاہرِ قدرت اُسے اپنی دلی آویزیوں کی طرف دعوت دے رہی ہیں۔ چنانچہ اس خیال کی بنا پر انھوں نے پہاڑ کی صدا، دریا کی صدا، طلوع سحر کی صدا، غروب آفتاب کی صدا، ستارۂ سحری کی صدا، شفق کی صدا، چاند کی صدا، آفتاب کی صدا، آدھی رات کی صدا، فصلِ گل کی صدا، سمندر کی صدا، پھول کی صدا کے نام سے چار

چار مصرعوں کی نظمیں لکھی ہیں، اور ہر ایک کے آخر میں پانچواں مصرعہ یہ ہے۔ ع

اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

نظمیں اچھی خاصی اور دلچسپ ہیں۔ اُردو زبان میں بہت غنیمت ہیں۔ نمونے کے طور پر دریا کی صدا نقل کی جاتی ہے ؎

مری لہروں میں بجلی کا خزانہ　　مری رَو میں محبت کا خزانہ
مرے دھارے میں عظمت کا ترانہ　　مری گرداب میں چنگ و چغانہ

اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

اوراقِ سحر

حضرتِ جوش صبح کے عاشق ہیں۔ وہ اسے دنیا کی ساری نعمتوں سے بڑھکر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اوراقِ سحر کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں "میں لٹریری کام اکثر طلوعِ آفتاب سے قبل ہی شروع کرتا ہوں ان نازک مضامین میں سے جو ان اوراق میں جمع کئے گئے ہیں، اکثر آیتیں طلوع سے پہلے ہی نازل ہوئی ہیں یہ وہ پنکھڑیاں ہیں جو صبح صادق کی چاندنی میں چُنی گئی ہیں"

اس کتابچے کے پہلے دو صفحوں میں نظم ہے اور باقی نثر ہے۔ اس میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے مگر ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح صبح سے ہے۔ طرزِ تحریر ان کا مخصوص ہے۔ نثر کے سب مضامین وہ اسی طرز میں لکھتے ہیں یعنی ٹیگور کی نقل اُڑائی ہے اور کہیں کہیں نبھائی ہے۔

کاغذ لکھائی چھپائی ان سب کتابچوں کی عمدہ ہے۔

رسالہ

صنعت وحرفت (صوبہ اورنگ آباد)

مُصنّفہٗ

محمد نظام الدین صاحب اسسٹنٹ انجنیر اورنگ آباد

یہ کتاب خاصی بڑی تقطیع پر ۹۲ صفحہ کی ہے۔ اس میں صوبہ اورنگ آباد کی صنعت وحرفت کی تاریخی کیفیت،

موجودہ حالت اور مختلف صنعتوں اور حرفتوں کی ترکیبیں اور طریقے جو اس وقت تک رائج ہیں درج کئے گئے ہیں جن میں سے بعض خاص بلدۂ اورنگ آباد سے مخصوص ہیں۔ علاوہ اس کے ان صنعتوں اور پیشوں کے بیان میں بہت سی مفید معلومات بھی درج ہیں۔ اس کے بعد مؤلف نے انگلستان کے ۱۰۵ کارخانوں کی فہرست دی ہے تاکہ جن پیشہ وروں کو ضرورت ہو خط و کتابت کرکے اپنے پیشہ کے متعلق نئی نئی کلیں منگا لیں اور اپنے پیشہ کو ترقی دے سکیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر قابل مؤلف انگلستان کے علاوہ امریکہ اور دیگر ممالک کے کارخانوں کی فہرست بھی دیدیتے۔ اس میں زیادہ آسانی ہوتی۔ اس فہرست کے بعد ایک فہرست ایسے اخباروں اور رسالوں کی دی گئی ہے جو خاص خاص پیشوں، صنعتوں یا تجارت سے متعلق ہیں۔ تاکہ پڑھے لکھے پیشہ ور یا شوقین اُن کے مطالعہ سے اپنی معلومات میں اضافہ کرسکیں اور دنیا میں جو ہر روز نئی ایجادیں ہوتی رہتی ہیں اُس سے باخبر رہیں۔ رسالوں کے علاوہ بعض بعض مستند اور مفید کتابوں کے نام بھی درج کردیئے گئے ہیں۔ یہ اخبار و رسالے سب کے سب ہندوستان کے ہیں۔ اگر امریکہ کے رسالے بھی درج فہرست کردیئے جاتے تو یہ فہرست زیادہ مفید ہوجاتی ہے۔ کیوں کہ امریکہ ان چیزوں میں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ اگر یہ کتاب دوبارہ چھپی تو مؤلف اس کا ضرور خیال رکھیں گے۔ اس کے بعد ایک فہرست اُن مدارس کی دی ہے جہاں مختلف صنعتیں اور پیشے سکھائے جاتے ہیں۔ اس میں بھی سب درسگاہیں انگلستان یا ہندوستان کی ہیں۔ کتاب کے آخر میں قابل مولف نے ایک بڑا نقشہ دیا ہے جو بہت دلچسپ ہے اس میں مختلف پیشہ ور کام کرتے ہوئے دکھائے ہیں۔ تصویریں اچھی ہیں اور ہر تصویر کے ساتھ مختصر پُرلطف کیفیت درج ہے۔ اس نقشے کو دیکھکر ملک کے تمدن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ کتاب کی چھپائی اچھی نہیں ہے۔ لائق مؤلف کا یہ کام اس زمانہ میں قابلِ قدر ہے۔[۱]

---

[۱] کتاب مؤلف صاحب سے مل سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ہندوستانی گھروں میں تیمارداری

مصنفہ

ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب

کتاب کی جلد اچھی، حروف جلی اور کاغذ عمدہ ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان سلیس اور ہدایات وغیرہ بہت آسان ہیں جنھیں ہر شخص بہ آسانی سمجھ کر عمل کر سکتا اور اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب جس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اُسے پورا کرے گی۔ گرچند امور اصلاح طلب معلوم ہوتے ہیں مثلاً ٹمپریچر چارٹ صرف ایک ہی ہے اگر کئی ہوں تو زیادہ مفید ہوں گے۔ اگرچہ نقشہ وغیرہ کافی تعداد میں ہیں لیکن اُن سہولتوں کے لحاظ سے جو اس زمانہ میں ہمیں میسّر ہیں قابل تعریف نہیں۔ بعض الفاظ کے ترجمہ میں بھی تبدیلی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اسٹرلائزنگ کے معنی میری رائے میں صاف کے بجائے پاک لکھنے چاہئیں۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ ایک چیز صاف ہو مگر پاک نہ ہو۔ اسی طرح سپس [illegible] کو بجس کہا جانے تو مناسب ہوگا۔

اسی مضمون کی ایک اور کتاب موسومہ انڈین ہوم نرسنگ مصنفہ میجر آر جے بلیکم مترجمہ زیر نگرانی علیا حضرۃ سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال بھی میری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب کتاب زیر تبصرہ سے دقیق ہے۔

حیدر علی خاں

ایف آر سی ایس (اڈنبرا) ایم۔ آر سی ایس (انگلینڈ)

ڈسٹرکٹ سول سرجن۔ اورنگ آباد

فہرست کتب

(سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو)

البیرونی کمالات ذہنی میں ابو ریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ، تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی اس کے حالاتِ زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے عہ

فلسفۂ اجتماع تالیف ہے اور اس کا موضوع نفس اجتماعی جماعت کے لیے اعمال و قوائے دماغی کے تحلیل و تشریح ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ عہ

قاعدہ و کلید قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ جن اُصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیے اُن کی تشریح کے لیے ایک کلید بھی تیار کی ہے۔ قاعدہ ۲؍ کلید قاعدہ ۴؍

دریائے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف و نحو اور روزمرہ و محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں۔ قیمت عہ

طبقات الارض اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند ہیں انگریزی اور اُردو داں دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک کر دی گئی ہے۔ قیمت عہ

مشاہیر یونان و روما۔ پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے

گریز ور اصول اختیار کیا گیا ہی اور ہر اصول کی تائید
میں تاریخی انتقاد سے کام لیا گیا ہی اس کے مطالعہ سے
معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہی۔
بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لیئے تجویز کی گئی
ہی۔ قیمت حصہ اوّل غیر مجلد عہ، حصہ دوم مجلد عا،

مقدمات الطبیعات یہ ترجمہ ہی انگلستان کے مشہور سائنس
داں حکیم ہکسلی کی کتاب کا ترجمہ ہی۔ جس کا نام کتاب کی کافی
ضمانت ہے، اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہی لیکن کتاب
علم و فضل کا مرقع ہی۔ متعلمان سائنس اور عام شائقین کے
لیئے بہت مفید ہی۔ قیمت عہ

فلسفۂ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور
نفسی ہی۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت
لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہی قیمت عہ

نکات الشعرا یہ اردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی تالیفات
سے ہی اس میں میر صاحب کی رائے اور زبان کے بعض
بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں
صاحب شروانی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ
لکھا ہی۔ قیمت عہ،

نپولین اعظم ایبٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ ہی
کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین کی زندگی بشری
جدوجہد کا آخری باب ہی، واقعات کی داد یا تو سکندر
کی زبان ادا کر سکتی ہی یا تیمور کی زبان، ترجمہ آسان اور عام
فہم ہی مکمل پانچ جلد قیمت عہ،

فلسفۂ تعلیم۔ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ
تعلیم کی آخری کتاب ہی۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ ہی والدین
و معلم کے لیئے چراغ ہدایت ہی تربیت کے زریں قوانین کو اسقدر
صحت کے ساتھ مرتب کیا ہی کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہی قیمت عہ،

رہنمایان ہند۔ مشہور کتاب پروفٹس آف انڈیا کا ترجمہ ہی شروع
میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ
میں لکھا ہی اس کے بعد سری کرشن جی مہاراج کی
سوانح اور گوتم بدھ کے پر اثر حالات آتے ہیں۔ آخری حصہ
میں شنکر اچارج رامانج اور رامانند کا ذکر ہی قیمت عہ

آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابین

خدا کے فضل و کرم سے ہندوستان بھر مین صرف یہی ایک کارخانہ ہے جو تمام مشہور و معروف مصنفین اُردو کی مکمل تصانیف کا ذخیرہ رکھتا ہے اور اُردو کی تقریباً کُل وہ کتابین جو قابل دید کہی جاسکتی ہین اپنے معزز قدردانون کی خدمت مین پیش کرتا رہتا ہے ملک بھر مین جتنی جدید عمدہ تصانیف شایع ہوتی ہین وہ کارخانہ ہذا مین فوراً منگائی جاتی ہین۔ اِس طرح جو صاحب الناظر بک ایجنسی سے معاملت رکھین گے اُن کو انشاءاللہ تعالیٰ اُردو کی کسی کتاب کے لیئے دوسرے کارخانہ کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہوگی۔ مختصر فہرست درج ذیل ہے مفصل فہرست بنام **مصنفین اُردو** طلب کرنے پر روانہ خدمت عالی ہوگی۔

المعلن: منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلی — سے/
- عود ہندی — ۱۲/
- دیوان غالب ٹائپ ایڈیشن — سے/

سر سید احمد خان مرحوم

- تفسیر القرآن جلد — عسعہ/
- مضامین تہذیب الاخلاق — للعہ/
- خطبات احمدیہ — ے/
- آثار الصنادید — ہے/
- تکمل مجموعہ لکچر — للعہ/
- اسباب بغاوت ہند — ۱/
- ابطال غلامی — عمصہ/

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات — عہ/
- دربار اکبری — ے/
- سخندان فارس — ے/
- نیرنگ خیال — ۱۰/
- مکتوبات آزاد — ۱۰/
- مجموعہ نظم آزاد — ۱۲/

مولانا حالی مرحوم

- مسدس حالی — ۸/
- یادگار غالب — عہ/
- حیات سعدی — عمصہ/
- دیوان حالی مع مقدمہ مجلد — للعہ/

مولانا نذیر احمد مرحوم

- ابن الوقت — عمصہ/
- ایامی — عمصہ/
- فسانہ مبتلا — عمصہ/
- مراۃ العروس — ۱۲/
- توبۃ النصوح — ۱۲/
- بنات النعش — ۹/
- مجموعہ لکچر ۲ جلد — صہ/
- ترجمۃ القرآن متوسط — معہ/
- الحقوق والفرائض ۲ جلد — صہ/
- اجتہاد — عمصہ/
- مجموعہ نظم بے نظیر — عمصہ/
- مبادی الحکمۃ — عمصہ/
- موعظہ حسنہ — عمصہ/
- رویائے صادقہ — عمصہ/

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی صلعم جلد دوم — ے/
- الفاروق — سے/
- الغزالی — عمصہ/
- المامون — عمصہ/
- سیرۃ النعمان — عمصہ/
- سوانح مولانا روم — ع/
- بیان خسرو — ۱۰/
- علم الکلام — ع/
- الکلام — ع/
- سفرنامہ مصر و شام و روم — زیر طبع
- رسائل شبلی — عمصہ/
- مقالات شبلی — عمصہ/
- مضامین عالمگیر — ۱۲/
- شعر العجم ۵ جلد — [illegible]
- مجموعہ کلام شبلی — ۱۲/

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان کامل ۱۰ جلد — عہ/
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ ۳ جلد — سے/
- آئین قیصری — عہ/
- کرزن نامہ — ۶/
- صحیفہ فطرت — ۶/
- محاربات عظیم — ۸/
- فلسفہ امثال — ۱۲/
- تقویم اللسان — ۶/
- تعلیم الانتظام — ۱۲/
- اہل عرب کا جبر مقابلہ — ۶۰/
- جغرافیہ ریاضیہ — ۱۲/
- جغرافیہ طبعی — ۸/
- رسالہ علم تناسب — ۶/
- رسالہ علم مساحت — ۱۲/
- معاون الحساب — ۱۲/

مولوی عبدالرزاق کانپوری

- البرامکہ — سے/
- نظام الملک طوسی مجلد — صہ/

مولوی عزیز مرزا مرحوم

- خیالات عزیز — عہ/
- دکرم اُروسی — عہ/

نواب محسن الملک مرحوم

- آیات بینات ۳ جلد — معہ/
- مضامین تہذیب الاخلاق — للعہ/
- مجموعہ لکچر — للعہ/
- تقلید و عمل بالحدیث — ۸/
- کتاب المحبت والشوق — ۸/

سید محمود مرحوم

- کتاب الطلاق — ۶/
- کتاب الشفعہ — ۶/
- شرح قانون شہادت — سے/
- لکچر — ۸/

خلیفہ محمد حسین مرحوم

- اعجاز التنزیل — سے/
- سفرنامہ برہما ۲ جلد — للعہ/
- تاریخ پٹیالہ — سے/

مولانا شہری مرحوم

- حیات انیس — ۶/
- ایشیائی شاعری — عہ/
- نورجہان بیگم — ۸/
- ٹیپو سلطان — عہ/
- حیدر علی سلطان — عہ/

مولوی چراغ علی مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق — عہ/
- تحقیق الجہاد — سے/
- اعظم الکلام ۲ جلد — سے/
- مجموعہ رسائل — سے/

مولوی احسان اللہ عباسی

- ترجمہ قرآن مجید — صہ/
- تاریخ الاسلام — للعہ/
- الاسلام — ۶/
- المجاہدہ — عہ/
- زاہدہ — عہ/
- نشتر سخن — سے/

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

- علمائے سلف — عہ/
- اسلامی اخلاق — ۸/
- نقش وفا — ۸/
- ذکر جمیل حبیب
- سیرۃ الصدیق — عہ/

منشی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری — ۶/
- حیات خسرو — ۱۲/
- حیات صالح — ۴/

مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات — عہ/
- حیات جامی — ۸/
- علوم عرب — عہ/
- خواتین — عہ/
- رسالہ محجوب الارث — ۴/

نواب علی حسن خان سلیم الملک

- فطرت الاسلام — ۶/
- المدنیۃ فی الاسلام — عہ/

مولوی رشید احمد انصاری

- تحریر المراۃ — عہ/
- المدنیۃ والاسلام — ۶/

منشی محمد حسن خان

- ترکوں کی معاشرت — ۶/
- ہاجرہ — ۶/

مسٹر ظفر علی خان بی اے

- جنگل میں منگل — ۶/
- سیر ظلمات — ۶/
- ڈراما جنگ روس و جاپان — عہ/
- فلسفہ ابن سینا — ۶/

- معاشرت — ۱۰/
- اپریل فول — ۸/

مولوی عبدالغنی وارثی مرحوم

- مسلمانان اندلس — عہ/
- تنقیح حقوق نسوان — ۱۲/

خواجہ غلام الثقلین مرحوم

- روزنامہ سیاحت — ۶/
- ایک فلسفیانہ لکچر اسلام — ۴/

مسٹر عنایت اللہ خان بی اے

- دعوت اسلام — سے/
- زلفی — ۸/

مسٹر ظفر عمر بی اے

- اینلی جیتھری حصہ اول — عہ/
- پولیسین حصہ دوم — عہ/

مرزا محمد ہادی بی اے

- امراؤ جان ادا — عہ/
- شریف زادہ — ۸/
- خونی مصور — عہ/
- لیلی مجنون — ۸/
- مثنوی امید و بیم — ۴/

مینیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

منشی امیر احمد مینائی مرحوم

کتاب	قیمت
امیر اللغات	عـ۵
مینائے سخن	عـہ
محامد خاتم النبیین	۸/

پروفیسر نواب علی

کتاب	قیمت
تذکرۃ المصطفیٰ	عـہ
معارج الدین	عـہ ۱۲
صحف سماوی	سے

انیس احمد عباسی بی اے

کتاب	قیمت
احمد وکیتھرینا	۶ـ/
نازنین آرمینیا	عـہ
زلیخا	۱۲/

مرزا داغ دہلوی مرحوم

کتاب	قیمت
مہتاب داغ	سے
گلزار داغ	عـہ
انتخاب داغ	عـہ
یادگار داغ	۸/
فریاد داغ	۵/

جلال مرحوم

کتاب	قیمت
مضمون ہائے دلکش	عصر

کتاب	قیمت
نظم نگارین	عصر
رسالہ تذکیر و تانیث	۸/
قواعد المنتخب	۴/
افادہ تاریخ	۸/

منشی سید برکات احمد

کتاب	قیمت
جمیلہ	۱۲/
بیوہ	۱۲/
یادگار سلف	۶/

منشی سجاد حسین مرحوم

کتاب	قیمت
احمق الدین	۸/
حاجی بغلول	زیر طبع
پیاری دنیا	۱۰/
طلسمی فانوس	۶ـ/
میٹھی چھری	۶/
کایا پلٹ	۱۲/

پنڈت رتن ناتھ سرشار

کتاب	قیمت
ہشو	۶/
پچھڑی دلہن	۸/
پی کہاں	۵/
کامنی	عـہ
خدائی فوجدار	۶ـ/
سیر کہسار ۲ جلد	سے

کتاب	قیمت
فسانہ آزاد	عـ۵
جام سرشار	عـہ

منشی جوالا پرشاد برق

کتاب	قیمت
رنالنی	۱۲/
ہار آستین	۱۲/
بنگالی دولہن	۱۲/
پرتاپ	۱۲/
معشوقہ فرنگ	۱۰/
بروگ	۵/

مولانا عبد الحلیم شرر

کتاب	قیمت
بتیہ بغدادی	عصر
ابوبکر شبلی	عصر
عزیز مصر	عـہ
دولت اسپانیہ ع ب حصہ	معہ ۱۲
صقلیہ میں اسلام	۱۴/
قیس و لبنیٰ	عـہ
فلپانا	عـہ
ماہ ملک	۶ـ/
منصور موہنا	۸/
شوقین ملکہ	عـہ
رومۃ الکبریٰ	عـہ
فلورا فلورنڈا	۶ـ/
خوفناک محبت	عـہ

کتاب	قیمت
حسن کا ڈاکو ۲ جلد	عـہ
دربار حرامپور	۱۰/
الفانسو	۱۲/
فاتح مفتوح	عـہ
جویائے حق ۲ جلد	للعہ
بابک خرمی ۲ جلد	عـہ
لعبت چین	عصر

حکیم محمد علی خان

کتاب	قیمت
جبرت کامل	سے
حسن سرور کامل	سے
دیول دیوی	عـہ ۹
گورا	۶ـ/
نیل کا سانپ	عـہ ۹
جعفر و عباسہ	عـہ ۱۲
اختر حسینہ	۶ـ/ ۸

منشی احمد علی شوق قدوائی

کتاب	قیمت
ترانہ شوق	۶ـ/
عالم خیال	۸/
قاسم و زہرہ	۱۲/
گنجینہ	۸/

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم

کتاب	قیمت
راحت زمانی	عـہ

کتاب	قیمت
رسوم دہلی	عصر
تسخیر شوہر	۱۲/
مہر افروز بیگم	۱۰/
کنز الفوائد	۸/
انشاء معہ تحریر النساء	عصر
تعلیم طبعی	۸/
لغات النساء	للعہ

مرزا حیرت دہلوی

کتاب	قیمت
سیرۃ الرسول ۲ جلد	سے
کتاب شہادت ۳ جلد	سے
مضامین حیرت	۶ـ/
حاجی بابا اصفہانی	عـہ
الف لیلیٰ دنیازاد	سے ۱۲
الف لیلیٰ شہرزاد	۶ـ/ ۸
روز الیبرٹ ۲ جلد	سے
کثرت ازدواج	۸/
ترک امیری ۲ جلد	۶ـ/

خواجہ عشرت لکھنوی

کتاب	قیمت
قواعد میر	۹/
ربازانی	۶/
اصلاح زبان اردو	۶/
شاعری کی پہلی کتاب	۸/
شاعری کی دوسری کتاب	۸/

مینیجر الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

حکیم احمد حسین الہ آبادی

کتاب	قیمت
تاریخ ابن خلدون جلد اول	عہ
" جلد دوم	عہ
" جلد سوم	عہ
" جلد چہارم	عہ
پنجم زیر طبع ، ششم	عہ
" ہفتم	عہ
" ہشتم	عہ
" نہم	عہ
" دہم	عہ
" یازدہم	عہ
صلاح الدین	عہ
نور الدین محمود	عصہ

مولوی انشاء اللہ

کتاب	قیمت
تزک تیموری	عہ
حالات قسطنطنیہ	عصہ
تاریخ مراکش و مغرب الاقصےٰ	۱۲/

مولوی محمد حلیم انصاری

کتاب	قیمت
تمدن اسلام ۲ جلد	سے
الاسلام والنصرانیۃ	۸/
اسلام و شوفسل یفارم	۸/
فتح اندلس	عہ
فلاح [illegible]	۱۲/

مولوی عبداللہ العمادی

کتاب	قیمت
کتاب المعارف	عہ
محکمات	عہ
تاریخ عرب قدیم	۱۰/
علم الحدیث	۸/
صناعۃ العرب	۴/
فلسفۃ القرآن	۳/
محرم کی بدعتیں	۴/

مولانا سید سلیمان ندوی

کتاب	قیمت
ارض القرآن ۲ جلد	۱۲/
لغات جدیدہ	عہ
مکاتیب شبلی ۲ جلد	سے
اہل السنۃ والجماعت	۸/
سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا	عہ

مولوی عبدالسلام ندوی

کتاب	قیمت
سیرۃ امام مسلم	۴/
سیرت عمر بن عبدالعزیز	عہ

پروفیسر عبدالباری ندوی

کتاب	قیمت
مبادی علم انسانی	عہ
برکلے کا فلسفہ	عہ
عقلیت و اسلام	۶/

خواجہ حسن نظامی

کتاب	قیمت
روزنامہ بلاد شرقیہ	عہ
روزنامچہ ہندوستان	۱۲/
میلاد نامہ	عصہ
محرم نامہ	عصہ
یزید نامہ	عہ
طمانچہ بر رخسار یزید	عصہ
محفل نامہ گیارھویں	۱۲/
کرشن بیتی	عہ
آپ بیتی	عصہ
جگ بیتی	۶/
خطوط حسن نظامی	۱۲/
بیوی کی تعلیم	عصہ
اتالیق خطوط نویسی	۱۲/
چٹکیاں اور گدگدیاں	۱۰/
بچوں کی کہانیاں	۱۰/
اردو دعائیں	۱۰/
اسلام کا انجام	۸/
سیر دہلی	عہ
غدر دہلی کے افسانے ۵ حصے	عہ
اسرار	۴/

پروفیسر شہباز مرحوم

کتاب	قیمت
زندگانی بے نظیر	عہ
خیالات شہباز	عصہ

مولانا راشد الخیری

کتاب	قیمت
صبح زندگی	عہ
شام زندگی	عہ
غب زندگی	عصہ
نوحۂ زندگی	۱۲/
منازل السائرہ	عصہ
جوہر قدامت	عہ
عروس کربلا	عہ
الزہراء	۱۲/
بنت الوقت	۸/
سراب مغرب	۸/
سات روحوں کے اعمال نامے	۶/
ماہ عجم	۸/
مودودہ	عصہ

مولوی بشیر الدین دہلوی

کتاب	قیمت
تاریخ بیجاپور ۳ جلد	سے
حرز اطفال	عصہ
نشاط عمر	عہ
عصائے پیری	عصہ
حسن معاشرت	عہ
اصلاح معیشت	عہ
اقبال دلہن	عہ
بچیوں سے دو دو باتیں	عصہ
عزم بالجزم	۴/

نیاز فتح پوری

کتاب	قیمت
جذبات بھاشا	۱۲/
گیتان جلی مجلد	عہ
گہوارۂ تمدن	عہ
کیوپڈ اینڈ سائکس	۸/
مریخی سیاح کی ڈائری	۶/

سیماب اکبرآبادی

کتاب	قیمت
خدیجۃ الکبریٰ	عہ
بنت الرسول	۵/
سیرۃ الحسین	عہ
جام کوثر	۵/

صفدر مرزاپوری

کتاب	قیمت
بزم خیال	عصہ
مشاطۂ سخن	عصہ

مہاشے پرکاش دیو

کتاب	قیمت
حضرت محمد صلعم	۸/
مہاتما بدھ ۲ جلد	عہ
مارٹن اور لوتھر	۸/
خدا اور روح	۱۲/
سیر المستورات	۱۲/
بچوں کی کہانیاں	۶/

میجر الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

اردو

۱- انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا

۲- یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔ حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحے ہوگا

۳- قیمت ہے سالانہ مع محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اُردو سے ہے

۴- تمام خط وکتابت:- آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیئے

(باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)